قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا بہتر واں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اکتوبر 2015ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

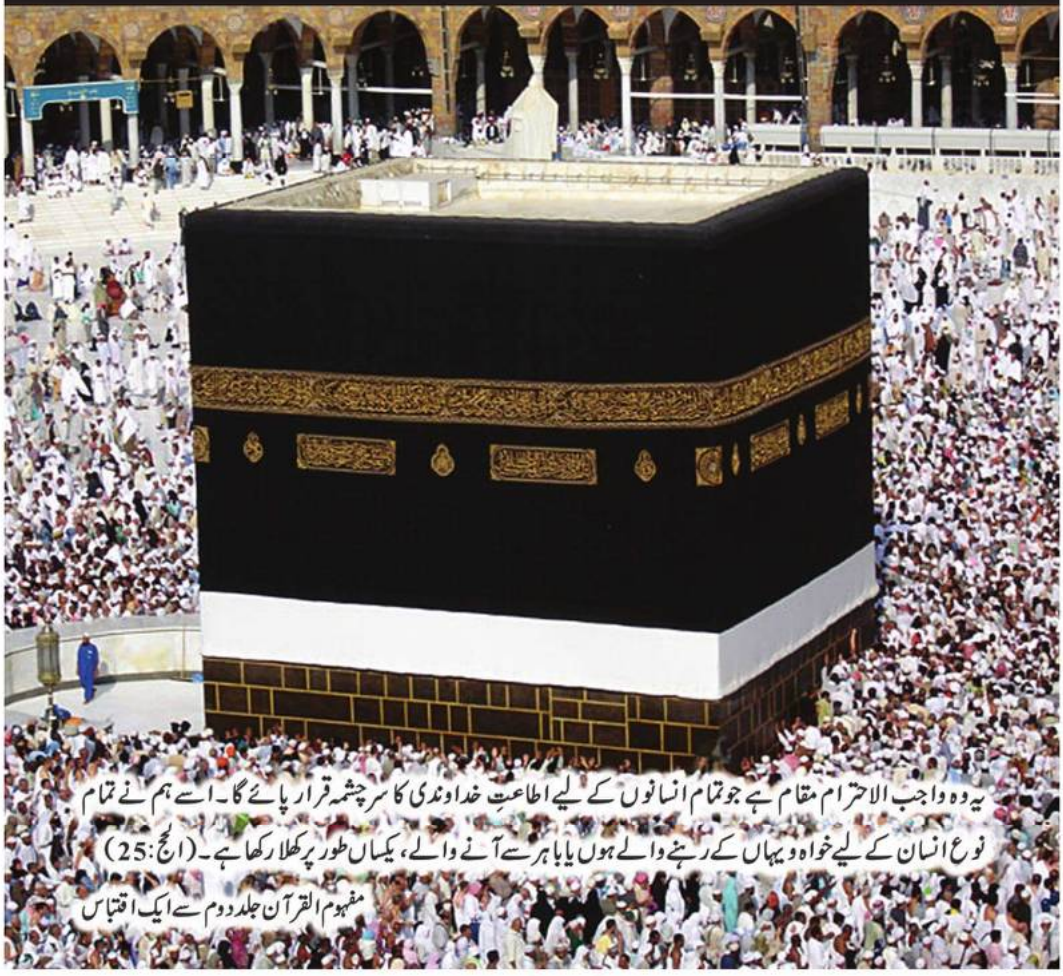

یہ وہ واجب الاحترام مقام ہے جو تمام انسانوں کے لیے اطاعتِ خداوندی کا سرچشمہ قرار پائے گا۔ اسے ہم نے تمام نوعِ انسان کے لیے خواہ وہ یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے، یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔ (الحج:25)

مفہوم القرآن جلد دوم سے ایک اقتباس

جلد 68 شمارہ نمبر 10 اکتوبر 2015ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ناشر وچیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت: ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق، خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِ تعاون	40 روپے فی پرچہ
پاکستان	-/450 روپے سالانہ
بیرون ملک	2500 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریہ اسلامی مملکت (قسط اوّل)	ملک منظور حسین لیل	8
اعلیٰ سطحی جامعاتی تحقیق کا معیار۔۔۔لمحۂ فکریہ	پروفیسر غازی علم الدین	23
وہ اندھا جس نے پوری قوم کو آنکھیں دیں		30
ماہنامہ ''اشراق'' کے ایک مضمون ''اسلام اور خلافت''	خواجہ ازہر عباس	35
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	43

ENGLISH SECTION

The Missing Link - By: Dr. Mansoor Alam 50

Surah *Al-Takwir* (التکویر) – *Durus-al-Qur'an* By G.A.Parwez
Parah 30: Chapter 11 Translated by: Dr. Mansoor Alam 54

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827

National Bank of Pakistan Main Market, Gulberg Lahore

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان)
فون: 042-35714546 E-mail: idarati@gmail.com

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبت مرغِ چمن کب تک!
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہین قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پر رُوح الامیں پیدا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

لمعات۔ادارہ

آل ورلڈ مسلم کانفرنس

جب سے انسان نے آنکھ کھولی ہے وہ اسی تگ وتاز میں غلطاں وپیچاں رہا کہ وہ کون سی صورت پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن وسلامتی سے رہ سکیں۔ اسے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان گنت تجارب کی بھٹیوں اور سنگلاخ وادیوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن وہ مقصود حاصل نہ کرسکا۔ زمان ومکان ہر آن بدلتے رہے۔ نظریاتِ حیات میدانِ تصادم میں برسرِ پیکار رہے۔ Antithesis, Thesis اور Synthesis کا عمل عقلِ محض کی ابلہ فریبیوں میں عافیت کوش رہا۔ اس طرح انسان اپنے ہی ہاتھوں سراب کا شکار ہوتا رہا۔ مدت کے بعد پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر اقوام مغرب نے جمیعتہ الاقوام (League of Nations) کی طرح ڈالی جو کردار اور عمل کے فقدان کی وجہ سے بری طرح ناکام ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے تو اسے کفن چوروں کی جماعت کہا تھا۔ اس کی ناکامی کی وجہ (Mr. Reeves) اپنی کتاب (Anatomy of Peace) میں لکھتا ہے کہ ''لیگ آف نیشنز'' کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یک جا کر کے باہمی بحث وتمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جاسکتا ہے۔ اس ناکام تجربے کے بعد ''لیگ آف نیشنز'' کی جگہ یعنی اس کا نام بدل کر (United Nations Organisation) اقوام متحدہ کی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس طرح سے یہ ناکام ہوئی ہے۔ اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ اس طرح کہ اس کی ایک سیکیورٹی کونسل ہے جس کے پندرہ مستقل رکن ہیں۔ ان میں سے پانچ یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین کو حق استرداد (Veto) کا اختیار دیا ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی معاملہ سیکیورٹی کونسل منظور کردے تو ان میں سے کوئی رکن بھی اسے رد (Veto) کرسکتا ہے جس سے تمام کارروائی منسوخ ہوجاتی ہے۔ گویا ان کا یہ عمل ان کے اپنے وجود کی نفی ہے۔ ظاہر ہے جو جماعت اپنے وجود کی خود نفی کردے منطقی طور پر (Virtually) اس تنظیم نے پورے کے پورے ادارے کو کالعدم کرنے کے خود اسباب پیدا کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ دوسری اقوام کو تو چھوڑیئے، مسلمانوں کا کوئی مسئلہ آج تک حل نہیں ہوسکا۔ کشمیر کا مسئلہ 1948ء سے اس کے ایجنڈا پر ہے اور ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اسرائیل سے عرب علاقے خالی نہیں کرا سکی۔ افغانستان اور عراق آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس کا کوئی فیصلہ نہیں کرا سکی۔ یہ چند مسائل ہیں جن کا تعلق عالم اسلام سے ہے۔ باقی علاقوں کے مسائل کا بھی کوئی خاطر خواہ حل نہیں ہوسکا۔ کافی عرصہ ہوا لندن کے اخبار ''ڈیلی میل'' نے لکھا تھا کہ جمعیت اقوام اپنی موجودہ

ہیئت میں امن عالم کے لئے سخت خطرہ کا موجب ہے اس لئے اسے فوراً ختم کر دینا چاہئے'' اور اس کی وجہ (Mr. Reeves) کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے۔ وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعے دور نہیں ہوسکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوع انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت۔ یعنی یہ وہی چیز ہے جسے علامہ اقبال نے کہیں پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

یہ حشر ہوا اس نظریہ حیات کا جو وحی کی راہنمائی سے محروم تھا اور صرف عقل کے گھوڑے پر سوار تھا۔

لیکن صدیوں پہلے وحدت آدم کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے مرکز انسانیت یعنی خانہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کیا کیونکہ مرکز کے بغیر انسانوں کا ایک برادری بننا اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ جب تعمیر کعبہ مکمل ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (22/27) ''تمام نوع انسانی کو یہاں جمع ہونے (حج) کا اعلان کر دے'' اور اس کی غایت یہ بیان فرمائی کہ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (22/28) ''تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں کہ نظام خداوندی کس طرح عالمگیر انسانیت کی منفعت بخشیوں کا ضامن ہے۔''

نصوص قرآنی سے حج کی جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں وہ اس طرح ہیں کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز وطن و زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں، محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے، جو انسانی تقاضوں کا ترجمان ہے، اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت، مرکز وحدت انسانیت، یعنی بیت اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرا اپنے میں سے ایک امیر الامرا کا انتخاب کر لیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایسا پروگرام مرتب کر لیں جو آئندہ سال کے

لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''سالانہ ترقیاتی پروگرام'' (Annual Development Programme) کہا جاتا ہے۔ پھر ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اسی پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان' مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر ان کے (Pros and Cons) کا عملی اثر اور ردعمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں گے' اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی ہوں گی جس کے لئے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ (5/1) کا ذبیحہ تجویز کیا گیا ہے جسے عرف عام میں قربانی کہتے ہیں۔ آخر میں یہ نمائندگان طواف کعبہ کے بعد اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں گے اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں اور نظم و نسق کو چلائیں گے۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن حکیم نے تمام نوع انسانی کو ایک امت واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے۔

قرآن حکیم کی رو سے اس اجتماع کی مکمل کارروائی کے لئے کم از کم تین مہینے بتائے ہیں۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (2/197) اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔

یہیں سے اقوام متحدہ نے بھی اپنے سالانہ اجلاس کے لئے کم از کم تین مہینے مقرر کر رکھے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

فریضۂ حج کا تقاضا ہے کہ اپنے اپنے ممالک کو لوٹ کر سب کچھ بھولنا نہیں بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو دنیا کے کسی گوشہ میں بھی ہو' زندگی کے کسی شعبہ میں مصروف تگ و تاز ہو اپنی توجہات کا رخ اسی مرکز کی طرف رکھو اور جو پروگرام وہاں سے مرتب کر کے لائے تھے۔ اس کا احترام کرنا ہوگا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ہوگا' کیونکہ آئندہ سال اپنی Progress Report وہیں جا کر پیش کرنا ہوں گی۔ اسی لئے خانہ کعبہ کو قبلہ کہا گیا ہے جس کو ہر وقت اپنے سامنے رکھا جائے۔ اگر کسی وجہ سے تکمیل پروگرام (A-D-P) میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کے (Bottle Necks) حج کے دوران بیان کرنا ہوں گے تاکہ ان کا تدارک کیا جا سکے۔ اسی لئے حج کا مقصود قرآن حکیم میں خاص طور پر دو مقامات پر مختصراً بیان کر دیا گیا ہے۔ ایک لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22/28) تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں اور اس کی غائت الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5/97) یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ حج سے مقصود جمعیت آدم'' کی تشکیل تھا۔ لیکن آج حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کی لامرکزیت کی وجہ سے عالم اسلام چاروں طرف سے مصائب سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشہ پر کہیں انکا نشان رہنے نہ پائے۔ لیکن ملت

اسلامیہ تختۂ غفلت پر سوئی ہوئی خراٹے لے رہی ہے۔ مسلمان ملکوں پر جو گزر رہی ہے آسمان کی آنکھ بھی اس پر پرنم ہے۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم وتشدد سے عاجز آ کر) فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم وتشدد پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے''۔ القرآن 4/75۔

پاکستان تو کجا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جو خدا کے متذکرہ حکم کے تحت مسلمانوں کی مدد کو پہنچ سکے؟ یہ وہی معاشرہ یعنی مرکز ملت (Central Authority) ہو سکتا تھا جس کی خصوصیت اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہوتی کہ ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اسلامی معاشرہ یعنی مرکز ملت کی حیثیت آنکھ جیسی ہوتی ہے۔ اگر انسانی جسم کے کسی حصہ میں تکلیف ہو تو آنکھ کو چین نہیں۔ اسی طرح اگر دنیا کے کسی حصہ میں کسی ایک مسلمان پر بھی ظلم ہو رہا ہو تو مرکز ملت حرکت میں آ جاتا ہے اور ظلم کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ لیکن افسوس! اس وقت وہ مرکز ملت کہاں جو قرآن کے قانون اور حکم کی قوت نافذہ بنتا!

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

ہماری لامرکزیت ہمارے زوال اور انحطاط کا سبب ہے۔ اس لئے حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنس منعقد کرنے پر ہی اکتفاء کئے ہوئے ہیں۔ عملی طور پر کچھ نہیں ہو سکا۔ لیکن ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

یہ نمی تمسک بالقرآن سے پیدا ہو گی اور پھر جب ہم نے اپنے اللہ سے' بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا' جس کی زندگی سے تمام نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے' اقوام عالم کی امامت ہمارے حصے میں آ جائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشت حیات سرسبز و شاداب ہو گی۔ آج مسلمانوں کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط اوّل

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (5/44-45-47)۔

انسان کی طرف آخری وحی (قرآن کریم) کا اوّل و آخر منشاء ایک ایسی حکومت کا قیام ہے جو انسان کے ہر قسم کے مسائل کو اطمینان بخش طریقے سے حل کر سکے۔ حضور کریم ﷺ کی زندگی مبارک پر نگاہ ڈالی جائے تو نظر آئے گا کہ اُن ﷺ کی زندگی کی ہر سرگرمی اور ہر عمل کا رُخ ایک قرآنی مملکت کے قیام کی طرف رہا۔ اُن ﷺ کی پوری زندگی کی جدوجہد، اُن ﷺ کا اعلانِ نبوت، تبلیغ، مقابلہ مخالفت اور مقابلہ مصائب و مشکلات، جنگیں، ہجرت، عبادات، محنت، سب کا مقصد و منشاء ایک مثالی اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اُن ﷺ کے اُسوہ حسنہ کا نتیجہ اور نچوڑ آخر کیا تھا؟۔ مدینہ منورہ میں ایک اسلامی حکومت کا قیام۔۔ حضور کریم ﷺ کے اُسوہ حسنہ کو انسانیت کے لئے بہترین نمونہ زندگی قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ پیروی اُسوہ رسول آخر الزماں ﷺ میں ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لئے دن رات محنت و کوشش کریں اور اُن کی زندگی کی ہر سرگرمی اور ہر عمل کا منتہائے مقصود ایک قرآنی حکومت کا قیام ہو۔

حضور ﷺ کی مکّی زندگی:

پرویز صاحب اسلامی حکومت کے قیام کو دین اسلام کا اصل و اولیں مقصدِ رسالت قرار دیتے ہوئے طلوع اسلام مارچ 1979ء صفحہ نمبر 28 پر لکھتے ہیں:۔ ''بعض کوتاہ بینوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب تک حضور ﷺ مکّہ میں رہے، اسلام کو وعظ و نصیحت تک محدود رکھا۔ لیکن جب مدینہ میں مملکت حاصل ہوئی تو سیاسی، معاشرتی، معاشی شعبوں کو مذہب کے دائرہ میں لے آیا گیا۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ نبوت کے آغاز ہی سے حضور ﷺ کے پیش نظر مملکت کا نظام تھا۔ مکّی زندگی اس مقصد کے حصول کی تیاری کا زمانہ تھا۔ کیونکہ قرآن کریم نے واضح کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت، ایمان اور اعمال صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔

مقصودِ رسالت:

تاریخ الکامل ابن اثیر میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں خود اپنے اہل خاندان کے نام جو پیغامات

بھیجے، ان میں ایک پیغام میں فرمایا:۔ یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے حکومتِ خداوندی کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟۔۔۔ اسی ضمن میں تاریخ الکامل ہی میں ایک اور واقعہ مذکور ہے۔

لکھا ہے:۔ شداد بن اوس کا بیان ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ دربارِ نبوی ﷺ میں حاضر تھے کہ قبیلہء عامر کا ایک معزز اور بزرگ سردار، اپنا عصا ٹیکتے اس حلقہ میں پہنچا۔ اس نے حضور ﷺ کی دعوت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ:۔ لکل قول حقیقۃ۔ وما حقیقۃ قولک۔ ہر دعویٰ کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپ کے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت کیا ہے؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیم اور بھائی عیسیٰ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامری نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کردوں تو مجھے کیا ملے گا؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا، جنت کے باغات۔ اُس نے کہا کہ یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا:۔ نعم النصر والتمکین فی البلاد۔ خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔۔۔ اس سے واضح ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضور ﷺ کے پیشِ نظر ایک مملکت کا حصول تھا جس میں ایسا نظام قائم کیا جا سکے جس کی نظیر کہیں نہ ملتی ہو۔ یہی مقصودِ رسالت تھا۔''

سنتِ رسول ﷺ:

اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں، خدا کی حکومت کے قیام کا فرض، اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ نے مدینہ میں جا کر ادا فرمایا۔ اس میں شک نہیں کہ، اس طرح حضور ﷺ کی سب سے بڑی سنت ایک مثالی اسلامی مملکت اور حکومت کا قیام ہے۔ ہمارے علماء و صلحاء اٹھتے بیٹھتے عبادات اور ذاتی معاملات میں سنت پر زور دیتے ہیں مگر ایک اسلامی ریاست اور حکومت کے قیام اور حکومتی معاملات میں ''سنتِ رسول ﷺ'' کا نام تک نہیں لیتے۔ اگر نام لیتے یا سیاست میں حصہ لیتے بھی ہیں تو سیکولر انداز میں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے علماء اور اہلِ تصوف (مذہبی پیشواء) عملاً سب سے زیادہ سیکولر ہیں یعنی دین (مذہب) کو سیاست سے دور رکھنے کے قائل ہیں (مئولف)۔

مقصد:

قرآن کریم نے بعثت نبی اکرم ﷺ کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ:۔ ''یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت

جکڑی ہوئی تھی اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بری طرح دبی ہوئی تھی'' (۷/۱۵۷)۔ علامہ پرویز صاحب کی نظر میں قرآن کریم کا اول و آخر مقصد و منشاء ایک ایسی حکومت کا قیام ہے جس میں انسان کو انسان پر حق حکومت حاصل نہ ہو۔ انسان آزاد ہو۔ انسان انسان پر ظلم نہ کر سکے۔ جس کا مقصد ہر انسان کو بلا تفریق و تخصیص ہر قسم کے حقیقی (سیاسی، معاشی، معاشرتی) انصاف کی ضمانت فراہم کرنا ہو۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:۔

کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہء شرعِ مبیں ایں است و بس

(نظامِ شریعت کا بنیادی نکتہ، تقاضا اور مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی انسان کسی بھی لحاظ سے کسی دوسرے انسان کا دست نگر، محتاج اور غلام نہ رہے)

کیونکہ اسلام کا نظام: موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے۔

فریضۂ رسالت:

عالمِ انسانیت کے لئے اس قسم کے مثالی منصفانہ نظام کے قیام کی خاطر ''اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ قرآنی احکام کو معاشرہ میں نافذ کرنا ہے۔ اس کا نام دین ہے۔'' (تبویب القرآن۔ جلد دوم۔ باب حکومت)۔ یہ فریضہ سب سے پہلے جناب رسول کریم ﷺ نے ادا فرمایا تھا۔ پرویز صاحب اپنی کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کے باب اول میں ''فریضہء رسالت'' کے تحت رقمطراز ہیں۔ ''خدا کی طرف سے سلسلہء رشد و ہدایت کا مقصد، انسانوں تک صحیح تعلیم پہنچا دینا ہی نہیں تھا۔ اس کی غائیت یہ تھی کہ انسانی زندگی کے، انفرادی اور اجتماعی، ہر گوشے میں خوشگوار انقلاب پیدا کر کے، کاروانِ انسانیت کو صحیح راستے پر گامزن کر دیا جائے، تاکہ اس طرح، زندگی، رفتہ رفتہ، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے پیغامِ خداوندی کو حروف و نقوش کی شکل میں دینے پر ہی اکتفاء نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ اسے خود انسانوں میں سے ایک فرد کے ذریعے، عام کیا جاتا۔۔۔ اس منتخب فرد کا (جسے رسول کہا جاتا تھا) یہ فریضہ تھا کہ وہ، اس پیغام کو عام کرنے کے بعد، ایسی قوم تیار کرے جو اس پیغام کا عملی پیکر بنے، اور اس نظام کو متشکل اور متمکن کر کے دکھا دے جو اس پیغام کی غائیت تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول کا فریضہء زندگی کس قدر اہم اور اس کی ذمے داری کیسی گراں بار ہوتی تھی۔ قرآن کریم نے رسول کے اس عظیم فریضہ کو چند مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (2/129)۔ وہ ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کرتا ہے، انہیں ان کی غرض و غائیت کی تعلیم دیتا ہے اور پھر مسلسل و پیہم تربیت سے ان کے جوہر انسانیت کی نشوونما کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے تعلیم و تربیت یافتہ انسانوں کے دلوں کو یک نگہی اور یک

مقصدی کے رشتوں میں منسلک، اور انہیں باہم دگر پیوست کر کے ایک ایسی اُمت کی تشکیل کرتا ہے جو اس پیغامِ خداوندی کو عملی نظام کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے۔ قرآن کریم خدا کا آخری پیغام تھا جس کے اندر وہ تمام قوانین و اصولِ حیات، جامع اور غیر متبدل شکل میں محفوظ کر دیئے گئے تھے جن کے مطابق عالمگیر انسانیت کو آخرالامر ایک حیات پرور اور انسانیت ساز نظام کے تابع زندگی بسر کرنی تھی۔''

ربّ:

اگر قرآن کریم کی پہلی آیت: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ پر تدبر کیا جائے تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی پہلی آیت میں نزولِ کتاب کا مقصد بیان فرما دیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر، اللہ تعالیٰ نے اپنے متعدد صفاتی اسماء میں سے، پہلی آیت میں صرف ''رب'' ہی کے لفظ کا انتخاب کیوں کیا۔؟ ''رب'' کے لفظ (دراصل ایک اہم قرآنی اصطلاح) کا عام ترجمہ ''پالنے والا'' کیا جاتا ہے کہ۔ ''تعریف اُس خدا کی جو دونوں جہانوں کا پالنے والا ہے۔'' آیت کے اس ترجمے سے مترشح ہوتا ہے کہ جب پالنے والی اللہ جیسی ہستی ہو تو پھر دنیا میں کوئی بھوکا نہیں مر سکتا۔ جبکہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ روزانہ سینکڑوں افراد بھوک سے مر جاتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ تو پھر ''رب'' کا ''پالنا'' چہ معنی دارد۔؟

لفظ ''ربّ'' کی جامعیت:

دراصل ''رب'' کا مطلب ہے۔ ''ایک ایسی ہستی یا طاقت جو کسی کی اس طرح نشوونما کرے کہ نشوونما پانے والے کی زندگی کی ہر منزل اور ہر سطح کی ضروریات کو اطمنان بخش طریقے سے پورا کرتی جائے۔'' اسی لئے پرویز صاحب نے ہر جگہ ''رب'' کا مفہوم ''نشوونما دینے والا'' ہی بتایا ہے۔ ہر منزل کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمے داری اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھی ہے، لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب نازل تو فرما دی مگر طاقت رکھنے کے باوجود اسے خود نافذ نہیں کیا بلکہ اس کے نفاذ کی ذمے داری (مومن) انسان کو دے دی۔۔ اسی طرح ''رب'' نے ''رزق اور رزق کے اسباب'' تو پیدا کر دیئے مگر ان کا انتظام وانصرام اور تقسیم کی ذمے داری انسان کو دے دی۔ (البتہ تقسیمِ رزق کے اصول وقواعد اپنی آخری کتاب میں دے دیئے۔) لہٰذا نظامِ ربوبیت (اسلامی حکومت) کے قیام کی ذمے داری مومنین پر عائد ہوتی ہے۔ غور فرمایئے کہ کیا ''رب'' کی جامع قرآنی اصطلاح میں صرف ''پالنے والے'' کا محدود سا تصور موجود ہے؟ نہیں!۔ اس ایک لفظ میں معانی ومفاہیم کا ایک بحرِ بیکراں سمٹا ہوا ہے۔ اس میں اسلام کا پورا نظامِ معیشت سمویا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشی نظام ہی کسی سیاسی نظام کی بنیاد ہوتا ہے ۔

لفظ ''ربّ'' کا مفہوم:

''رب'' کے لفظ کے اندر اسلام کے (معاشی وسیاسی) دونوں نظام مضمر اور موجود ہیں۔ موءلف کی نظر میں لفظ ''رب'' کا

مفہوم "ہر قسم کی خامیوں اور غلطیوں سے پاک، ہر لحاظ سے ایک مکمل (perfect) نظامِ معیشت عطا کرنے والا" زیادہ مناسب ہے۔ لہٰذا ہمیں قرآن کریم کی پہلی آیت میں "رب" کا ترجمہ صرف "پالنے والا" کہہ کر یونہی آگے نہیں بڑھ جانا چاہیئے بلکہ اس اصطلاح کے منشاء کو سمجھ کر، اس کے مطابق اپنی سرگرمیوں کا رُخ اصل مقصد (قیامِ اسلامی مملکت) کی طرف موڑ دینا چاہیئے (موءلف)۔

طلوعِ اسلام فروری 1972ء، ص:45: "قرآن کریم (میں سورہء فاتحہ) کی ابتداء۔ الحمدللہ رب العالمین۔ سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخورِ حمد وستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے۔ اور قرآن کی آخری سورت میں رب الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لئے مستحقِ حمد وستائش ہوتی ہے کہ یہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی ہے۔۔ اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔۔۔۔۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحقِ تعریف وتوصیف قرار نہیں پاسکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے اربابِ بست و کشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروفِ تگ وتاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوارِ حمد وستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس، دوسرے اربابِ اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3/187)۔ ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بناء پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گزار ہونا بھی چاہتا ہے تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76/9)۔ ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔"

نظامِ ربوبیّت:

طلوعِ اسلام ستمبر 1983ء، ص:2:۔ "پاکستان میں برسوں سے "اسلامی نظام" کے الفاظ زبان زدِ عام ہیں، لیکن ہر اس قوم کی طرح جس کی منزل متعین نہ ہو، ان الفاظ کا مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں۔ کسی نظریہ یا اقدام کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا کوئی معیار مقرر نہیں۔ اور چند تعزیری قوانین کو "نظام" سمجھ لیا گیا ہے۔ نظام نام ہوتا ہے کسی معاشرہ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا۔ لہٰذا، اسلامی نظام کے معنی ہوں گے، ایسا معاشرہ جس میں اسلام (یعنی قرآن) کے تقاضے من حیث الکل پورے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان تقاضوں کا آغاز، اپنے افتتاحیہ (سورہء فاتحہ) کی پہلی آیت سے کر دیا ہے۔ جب کہا کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1/1)۔ "خدا کی ذات مرجع حمد وستائش ہے، اس لئے کہ اس نے ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ لے رکھا ہے۔" "ربوبیت" کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کی نشوونما کے لئے جس سامان کی ضرورت ہو، اسے مہیا کرنا۔ انسان عبارت ہے

اس کے جسم اور ذات (نفس یا خودی) سے۔ اس کی ذات کی نشوونما کا سوال تو الگ ہے۔ اس کے جسم کی نشوونما کے لئے رزق کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں انسان کی جملہ طبعی ضروریات آجاتی ہیں۔۔۔ رزق کی ذمہ داری کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (6/151)۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں، اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔'' ۔ دین میں پیچیدگیاں پیدا کرنے والے کہا کرتے ہیں کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اگر کسی کو روٹی نہیں ملتی یا اس کی اولاد بھوکی مرتی ہے، تو اس کی ذمہ داری کسی انسان پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ بھوکے نہ مریں تو وہ خود انہیں رزق مہیا کر دیتا۔ سنیئے کہ قرآن ایسا کہنے والوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔ سورہ یٰسین میں ہے کہ: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ ۔ ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق تمہیں خدا نے عطا کیا ہے اسے دوسرے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کھلا رکھو (اس پر سانپ بن کر نہ بیٹھ جاؤ)۔'' قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ (36/47) ''تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ تم ہم سے کہتے ہو کہ ہم غریبوں کی روٹی کا انتظام کریں۔

انسان کے ہاتھوں:

اگر خدا کو منظور ہوتا کہ وہ بھوکے نہ رہیں، تو وہ خود ہی انہیں روٹی کھلا دیتا۔'' خدا کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا کہ: إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (36/47)۔ ''ان سے کہو کہ جو کچھ تم کہتے ہو، وہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔'' ۔ آپ نے غور فرمایا کہ خدا نے کیا کہا ہے؟ ۔ اس نے کہا ہے کہ یہ کہنا کہ خدا کو بھوکوں کی روٹی کا انتظام براہِ راست کرنا چاہیئے، کافرانہ ذہنیت اور گمراہانہ مسلک ہے۔ خدا بھوکوں کو براہِ راست روٹی نہیں کھلایا کرتا۔ وہ اپنی اس ذمہ داری کو انسانوں کے ہاتھوں پوری کراتا ہے۔ اور یہ اس نظامِ مملکت کی اوّلیں ذمہ داری ہوتی ہے، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:۔ جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ اور اس کی عملی تفسیر حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ:۔ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کے ہاں، عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ اس حقیقت کو اس حدیث میں بڑے دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے جسے (حسنِ اتفاق سے) صدرِ مملکت (ضیاء الحق) نے اپنے 12، اگست (1983ء) کے خطاب کے آخر میں پیش کیا تھا۔ اس روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں ایک شخص سے کہے گا کہ میں بیمار تھا، تم میری عیادت کے لئے کیوں نہیں آئے؟ ۔ وہ کہے گا کہ الٰہ العالمین! آپ کس طرح بیمار ہو سکتے ہیں؟ ۔ جواب ملے گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا۔ تم اس کی تیمارداری کے لئے نہیں گئے تھے۔ ایک اور شخص سے خدا کہے گا کہ میں پیاسا تھا۔ تم نے مجھے پانی پلایا تھا؟ ۔ وہ کہے گا باری تعالیٰ آپ کیسے پیاسے ہو سکتے ہیں۔ جواب ملے گا۔ میرا فلاں بندہ پیاسا تھا۔ تم نے اسے پانی نہیں پلایا۔ ایک اور شخص

سے وہ کہے گا کہ میں بھوکا تھا۔تم نے مجھے روٹی کھلائی تھی؟۔ وہ کہے گا کہ آپ کس طرح بھوکے ہو سکتے ہیں۔ جواب ملے گا۔ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا۔تم نے اسے روٹی کھلائی تھی؟۔۔۔ یہ ہے کسی نظام کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا معیار!۔ یہ معیار ایسا محسوس اور مرئی ہے جسے اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں، اور بہرے بھی سن سکتے ہیں۔اس کے لئے نہ کسی ''ہدایہ'' سے مشورہ کرنے کی حاجت ہے، نہ کسی ''شامی'' سے فتویٰ لینے کی ضرورت۔اس نظام کو دیکھنے کے لئے ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں۔دیگر مسلم ممالک کو تو چھوڑیئے۔ حریمِ کعبہ کی فضاؤں تک میں بھی بھیک کے لئے ہاتھ پھیلے دکھائی دیں گے۔علّامہ اقبال نے، پاکستان کے مقاصد بیان کرتے ہوئے 1937ء میں قائدِ اعظمؒ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ:۔اسلامی قانون کے گہرے اور طویل مطالعہ کے بعد، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اسے عملاً نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فردِ معاشرہ کو روٹی کی ضمانت مل سکتی ہے۔لیکن اس ملک میں اس اسلامی شریعت کا نفاذ ناممکن ہے جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد (ایک یا ایک سے زیادہ) مملکتیں نہ ہوں۔ (اقبال کے خطوط بنام جناح، ص:16)۔وہ مملکت تو مل گئی لیکن اس شریعت کا نفاذ اس میں بھی نہ ہو سکا۔''

اسلام دین ہے:

اسلام ایک ''مذہب'' نہیں بلکہ ''دین'' ہے۔پرویز صاحب نے اپنی کتاب ''انسان نے کیا سوچا؟'' کے باب ''مذہب'' کے آخر میں فٹ نوٹ میں وضاحت کی ہے کہ:۔''قرآن نے مذہب کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔وہ دین کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کے معنی ضابطہء زندگی یا قانونِ حیات کے ہیں۔وہ زندگی کی راہنمائی کے لئے چند غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار دیتا ہے۔یہ اصول ملتے تو اُس سرچشمہء علم سے ہیں جو عقل سے ماوراء ہے لیکن وہ اس قدر علم و بصیرت اور عقل و شعور کے مطابق ہیں کہ قرآن انہیں عقل کی بنا پر منواتا ہے۔اس کے نزدیک وہ ایمان، ایمان ہی نہیں، جس کی تائید عقل و بصیرت نہ کرے۔ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر دور کے انسان، اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق، جزئی قوانین خود مرتب کرتے ہیں۔جو معاشرہ اس طرح قائم ہوتا ہے اسے ''جماعتِ مومنین کا نظام'' کہتے ہیں۔مومن کے معنی ہیں دنیا کو امن کی ضمانت دینے والا۔اس معاشرہ کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے اسے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کیا جائے۔''

دین سیاست سے جدا نہیں:

دنیا کے کسی بھی مذہب کے مقابلے میں، دینِ اسلام کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں دین اور دنیا الگ الگ نہیں۔اسلام دین کو سیاست سے جدا نہیں کرتا۔یہ ایک اجتماعی نظام ہے۔لہٰذا اسلام اللہ کے قوانین کے مطابق، اللہ کی زمین پر ایک حکومت

قائم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ جبکہ ''مذہب'' انسان کی ایک ''انفرادی'' سرگرمی ہے۔ مذہب کو انسان کے اجتماعی مسائل کے حل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس میں انسان اپنی ''نجات اور بخشش'' کے چکر میں سرگرداں رہتا ہے۔ لہٰذا اسے حکومتی اور سیاسی معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مذہب چند عبادات پر سختی سے کاربند رہنے کو ذریعہء نجات سمجھتا ہے۔ جبکہ دین مکمل ضابطہء حیات ہونے کے سبب، سیاست (قیامِ اسلامی حکومت) کو اہم ترین فریضہ قرار دیتا ہے۔ اور دین میں اسی فریضہ کی انجام دہی ذریعہء نجات ہے (مئولف)۔

اسلام اور مذاہبِ عالم میں خصوصی فرق:

مولانا ابوالکلام آزادؒ کو دنیا کے نابغہء روزگار افراد میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے قرآن کریم کا رواں ترجمہ ''ترجمان القرآن'' کے نام سے کیا تھا۔ جبکہ سورہء فاتحہ کی ایک طویل تفسیر ''اُم الکتاب'' کے نام سے شائع کی تھی جسے اُس وقت کے علماء نے ایک عظیم تفسیر قرآن قرار دیا تھا مگر بہت سے لوگوں نے اسے ایک سیاسی (کانگرس کی خاطر لکھی گئی) تفسیر قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام اپنے سلسلہء کوثر کی کتاب ''موجِ کوثر'' میں مولانا کی اس تفسیر پر علماء کی تنقید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''ان پر اعتراض کرنے والوں میں نہ صرف ان کے سیاسی مخالف مثلاً جناب غلام احمد پرویز تھے بلکہ ان کے محب اور عقیدت مند مولانا غلام رسول مہر نے بھی ان سے اختلاف کیا لیکن مولانا اپنی رائے سے نہیں ہٹے۔'' اس سلسلے میں علّامہ پرویز صاحب کے مجموعہء مضامین ''فردوسِ گُم گشتہ'' میں شامل مقالہ ''کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟'' کا مطالعہ فائدہ مند ہوگا۔ جناب پرویز صاحب ''مطالب الفرقان'' کی پہلی جلد میں آیت نمبر 2/3 کی تفسیر کرتے ہوئے **مولانا آزادؒ کی غلط نگہی** پر تبصرہ کرتے ہیں:۔

برہموسماجی تحریک:

''اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مغالطہ کو بھی دور کر دیا جائے جو اس سورۃ کے محولہ بالا آیت (2/62) کے مفہوم سے پیدا کیا جاتا ہے۔ گزشتہ (انیسویں) صدی عیسوی میں بنگال (ہندوستان) کے ایک ہندو راہنما، راجہ رام موہن رائے، نے ایک تحریک اُٹھائی جو ''برہموسماج'' کے نام سے متعارف ہوئی۔۔ اس تحریک کی بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ کہ حقیقت اور صداقت صرف اُن کے پاس ہے، کسی اور مذہب میں نہیں، باطل ہے اور ان کے باہمی اختلافات و نزاعات کا موجب۔۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ ان سچائیوں کو یکجا کر کے، انہیں صحیح تسلیم کر لینے سے تمام مذہبی نزاعات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس تحریک کا نام ''برہموسماج'' تھا۔ کچھ عرصہ تک اس تحریک کا چرچا رہا۔ لیکن یہ آگے نہ بڑھ سکی۔ 1931ء کے لگ بھگ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی مشہور تفسیر، ترجمان القرآن، کی پہلی جلد شائع کی تو اس نظریہ کو دہرایا گیا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ:۔ (1)۔ اسلام نے نہ

صرف یہی بتلایا ہے کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔(2)۔اس نے کہا کہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین ایک ہی ہے۔وہ دینِ حقیقی کیا ہے؟۔وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا،اس کے لئے نجات ہے،خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔۔(3)۔ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترکہ اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔(4)۔ اس نے کہا کہ اصل دین (یعنی ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی) کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔(بحوالہ:۔ترجمان القرآن۔جلد اول۔۔۔1947ء، ایڈیشن۔صفحات نمبر 214، 213، 189، 266 کا تشریحی نوٹ)۔۔مولانا آزاد (مرحوم) مسلمانوں میں ایک عالمِ دین اور مفسّرِ قرآن کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا لوگوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر تھا۔اور ان کی اس تفسیر کا مدتوں سے انتظار تھا۔چنانچہ جب یہ شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا۔اور مختلف گوشوں سے اس کی تعریف وتوصیف میں غلغلے بلند ہوئے۔لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس میں کس قسم کا ''برہمو سماجی اسلام'' پیش کیا گیا ہے اور اس کے مضرت رساں اثرات کیا نتائج پیدا کر سکتے ہیں تو میں نے اس پر مبسوط تنقید کی جو دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے مشہور مجلہ ''معارف'' کی جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔اس تنقید کو اربابِ نظر کے حلقہ میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور مختلف گوشوں سے مولانا آزاد کی تفسیر کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔میں نے اس میں اصولاً دو نکات پیش کئے:۔(1)۔یہ کہنا تو صحیح ہوگا کہ عالمگیر سچائیاں ہر بانیٔ ''مذہب'' (نبی یا رسول) کو وحی کی رو سے یکساں طور پر ملی تھیں لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ سچائیاں آج بھی تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں،اس لئے کہ وہ دین جو ان انبیاء کرامؑ کو اپنے اپنے وقت میں ملا تھا کسی اہلِ مذہب کے ہاں اصلی،حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود نہیں۔یہ صرف قرآن کریم کے اندر موجود اور محفوظ ہے۔اور (2)۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تمام اہلِ مذاہب کو رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور برملا کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات وسعادت کی کوئی راہ نہیں۔

اس کے بعد مسلمانوں میں تو مولانا آزاد (مرحوم) کے اس نظریہ کا اثر کم ہوتا چلا گیا،لیکن ہندوؤں نے اسے بہت اچھالا۔چنانچہ جون 1941ء میں،شوالا پور،کے مقام پر ''تمام مذاہب کی کانفرنس'' منعقد ہوئی تو اس کے صدر پنڈت سُندر لال جی نے مولانا آزاد کی تفسیر کی تائید سے اس نظریہ کو ابھارا اور جب (تحریکِ پاکستان کے دوران) ہندوؤں کے سب سے بڑے لیڈر،مسٹر گاندھی نے،تمام ملک کے لئے ایک مشترکہ تعلیمی سکیم کا منصوبہ تیار کیا تو اس میں اس نظریہ کو خاص اہمیت دی گئی۔۔۔للہِ الحمد کہ اس زہر آلود اور اسلام کُش اسکیم کے بُت کو پاش پاش کرنے کی سعادت بھی اسی ہیچمیرز کے حصہ میں آئی

اور (اُس دور کے مجلہ طلوع اسلام میں شائع شدہ) ایک ہی مقالہ نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ (یہ مقالہ ''واردھا کی تعلیمی اسکیم'' کے عنوان سے چھپا تھا اور اس کے بعد (متعدد زبانوں میں) اس کا پمفلٹ ہزارہا کی تعداد میں سارے ہندوستان میں تقسیم ہوا تھا۔ اس سے یہ فتنہ فرو ہوا تھا)۔''

بات دراصل یہ تھی کہ مولانا آزادؒ کا یہ نقطہء نظر تھا کہ تمام ادیان کی بنیادی سچائیوں میں کوئی فرق نہیں ہے جس پر پرویز صاحب نے سخت تنقید کی کہ اگر تمام ادیان کی بنیادی سچائیاں ایک جیسی ہی ہیں تو پھر اگر اسلام پر ایمان نہ لایا جائے تو فرق کون سا پڑے گا؟۔ پھر اسلام اور دیگر ادیانِ عالم میں فرق کیا ہے؟۔ ایسے حضرات جن باتوں کو ادیان کی بنیادی سچائیاں سمجھتے ہیں، اُن پر تبصرہ کرتے ہوئے پرویز صاحب اپنی منفرد تصنیف ''نظامِ ربوبیت'' کے تعارف میں وضاحت سے لکھتے ہیں کہ:۔

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

(عقل، جو صرف اپنے آپ میں مگن رہتی ہے، دوسروں کی فلاح و بہبود سے غافل رہتی ہے۔ وہ صرف اپنے فائدے کو دیکھتی ہے، دوسرے کے فائدے کو نہیں دیکھتی۔ جبکہ وحیء حق سب کے فائدے کو نظر میں رکھتی ہے۔ اس کی نگاہ میں سب کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ مؤلف)۔ آپ کسی مسجد کے منبر سے سنیئے یا جلسہ گاہ کی سٹیج سے، ہر مقام اور ہر گوشے سے یہ آواز آپ کے کانوں میں آئے گی کہ اسلام ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی مثال اور نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ وہ ضابطہء حیات ہے کہ اگر ساری دنیا کے مفکرین، سیاسیین اور مصلحین اکٹھے ہو جائیں تو بھی اس جیسا مکمل ضابطہء حیات مرتب کرنا تو ایک طرف وہ اس کی کسی ایک شق کے مثل بھی مدون نہیں کر سکتے۔ یہ نوعِ انسانی کی تمدنی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، اجتماعی اور انفرادی مشکلات کا واحد اور عدیم النظیر حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ دعویٰ (جس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں) آپ کو ہر گوشہ سے سنائی دے گا۔ لیکن اگر آپ ان حضرات سے پوچھیں کہ اسلام کی وہ کونسی تعلیم ہے جو بے مثل و بے نظیر ہے اور جس کی مثال دنیا بھر کے مفکرین اکٹھے ہو کر بھی پیدا نہیں کر سکتے تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ ان کے ہاں سے اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکے گا۔ وہ اگر کہیں گے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، بد دیانتی نہ کرو، بے انصافی نہ کرو، کسی کو ستاؤ نہیں، ہر ایک سے حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک سے پیش آؤ، سب کو بھائی بھائی سمجھو، ہر ایک سے ایک جیسا برتاؤ کرو وغیرہ وغیرہ۔ یا دوسری طرف وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام کے مصالح اور منافع سامنے لے

آئیں گے۔ سوال یہ ہے کہ جہاں تک اس اخلاقی تعلیم کا تعلق ہے وہ کونسی چیز ہے جو اسلام کے سوا کہیں نہیں ملتی؟۔ یہ اخلاقی تعلیم دنیا کے تمام مذاہب میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ کسی مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتے اور خدا کی ہستی تک کے منکر ہیں، وہ بھی اس اخلاقی تعلیم کے قائل ہیں۔ وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے، چوری ضرور کرنی چاہیئے۔ لوگوں کو ستانا اور اُن پر ظلم کرنا قابلِ ستائش ہے۔ بددیانتی قابلِ فخر ہے۔ لہٰذا، اگر اسلام کی مابہ الامتیاز تعلیم یہی ضابطہء اخلاق ہے تو اس سے اس دعویٰ کی صداقت تو ثابت نہیں ہوسکتی کہ اس کی تعلیم بے مثل و بے نظیر ہے۔ باقی رہا نماز، روزہ وغیرہ کا سوال، تو آپ انہیں زیادہ سے زیادہ باقی مذاہب کے طریقِ عبادت اور رسومِ پرستش سے بہتر ثابت کر دیں گے۔ لیکن جب فریقِ مقابل آپ پر یہ اعتراض کرے گا کہ ان تمام شعائر کی پابندیوں کے باوجود، خود مسلمانوں کی جو حالت ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، تو اس کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اگر آپ کچھ کہیں گے تو فقط اتنا کہ اُن کی دنیاوی حالت تو بیشک خراب ہے لیکن اس سے اُن کی ''روحانی ترقی'' ہوتی ہے اور عاقبت سنورتی ہے اور یہ چیزیں دوسرے مذاہب میں حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ لیکن یہ وہ دعویٰ ہے جس کا آپ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ ''روحانی ترقی'' کسی خارجی معیار سے ماپی نہیں جا سکتی۔ نہ کسی محسوس ترازو سے اسے تولا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ہر مذہب روحانی ترقی کا مدعی ہے اور آپ کے پاس کوئی معیار ایسا نہیں جس سے آپ علیٰ وجہ البصیرت ثابت کر سکیں کہ آپ کے مسلک و مشرب کے مطابق تو روحانی ترقی ہوسکتی ہے اور دیگر مذاہب کی روش پر چلنے سے ایسا نہیں ہوسکتا۔ باقی رہا آخرت کی نجات کا سوال تو اس کا ثابت کرنا روحانی ترقی سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہر مذہب اس کا یکساں مدعی ہے اور کوئی مذہب بھی اس کا مرئی اور محسوس ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔

(2)۔ آپ نے غور کیا کہ وہ دعویٰ جسے ہم تمام عمر سنتے اور دہراتے رہتے ہیں، ذرا سے غور و فکر کے بعد کس طرح بلا دلیل نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ یہ دعویٰ تو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور اس کے سچا ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں۔ لیکن ہم جن گوشوں میں اس کی صداقت کی دلیل تلاش کرتے ہیں وہ اس کی دلیل بہم نہیں پہنچاتے۔ اس کی دلیل ہمیں کسی اور گوشے میں ملے گی۔

روحانی ترقی:

قرآن کریم سے پہلے دنیا کے تمام مذاہب نے مذہب کا منتہیٰ ''روحانی ترقی'' اور ''اُخروی نجات'' قرار دے رکھا تھا۔ دنیاوی معاملات سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہوں نے زمین کی بادشاہت ''قیصر'' کے سپرد کر رکھی تھی اور اپنے لئے آسمان کی بادشاہت مخصوص کر لی تھی۔ دنیا اور دنیا والوں کے معاملات ان کی نگاہوں میں اس قدر قابلِ نفرت تھے کہ وہ ان کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دنیوی چیزوں کی کشش و جاذبیت ان کے نزدیک روحانی ترقی کے مانع اور اُخروی نجات

کے راستہ میں سنگِ گراں تھی۔ چونکہ روحانی ترقی اور اُخروی نجات کا دعویٰ ایسا تھا جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی، اس لئے ہر مذہب کے پیرو اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے کہ وہ حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ قرآن نے اس تصور میں کیا تبدیلی پیدا کی، اس کا ذکر ذرا بعد میں آئے گا۔ لیکن مسلمانوں نے قرآن کو عملاً چھوڑ دینے کے بعد بعینہٖ وہی مسلک اختیار کر لیا جو دیگر مذاہب نے اختیار کر رکھا تھا۔ انہوں نے بھی دنیا اور اس کے دھندے سلاطین کے سپرد کر دیئے اور مذہب کا دائرہ، روحانی ترقی اور آخرت کی نجات قرار دے لیا۔ لہٰذا اگر آپ چاہیں کہ آپ اس معیار کے مطابق اسلام کو مذاہبِ عالم کے مقابلہ میں بے مثل و بے نظیر ثابت کر دیں تو یہ ناممکن ہے۔ اس کے لئے نہ اُن کے پاس بین ثبوت ہے نہ آپ کے پاس۔'' مطلب یہ ہے کہ اسلام جن باتوں کو برائیاں کہتا ہے، دوسرے مذاہب بھی انہیں اچھائیاں قرار نہیں دیتے تو پھر اسلام اور مذاہبِ عالم میں فرق کونسا ہے؟ شروع میں کہا جا چکا ہے کہ اسلام ایک ''مذہب'' نہیں بلکہ ''دین'' (مکمل ضابطہء حیات) ہے۔ اس ضابطہء حیات میں دنیاوی (بشمول سیاسی) معاملات، دین سے الگ نہیں۔ مذاہبِ عالم اور دینِ اسلام میں بنیادی اور خصوصی فرق ہی یہی ہے کہ دینِ اسلام قرآن کریم کے مطابق ایک ایسی مملکت اور حکومت قائم کرنے کا تقاضا کرتا ہے (اور ایسی حکومت قائم نہ کرنے والوں کو کافر قرار دیتا ہے۔ ۵/۴۴) جو عالمِ انسانیت کے ہر قسم کے مسائل کو حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے پاس دنیا کا بے مثل و بے نظیر معاشی و سیاسی نظام موجود ہے (مؤلف)۔

مومن کی زندگی:

پرویز صاحب کا ایک مشہور مقالہ بعنوان ''مومن کی زندگی'' ہے جو طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ:۔ ''قرآن کریم کی تعلیم، انسان کو کیا بنا دیتی ہے، اس کی تفصیل میں جایئے تو کئی مجلدات درکار ہوں گی لیکن اگر اسے اجمالی طور پر بیان کرنا چاہیں تو اس سے بہتر، جامع اور حسین انداز میں کچھ اور نہیں کہا جا سکتا جسے علامہ اقبال نے اس ایک مصرعہ میں سمو دیا ہے کہ:۔ ع:۔ آنچہ حق می خواہد، آں سازد تُرا۔ قرآن کی تعلیم انسان کو وہ کچھ بنا دیتی ہے جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ یہ بن جائے۔ یعنی جس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے، وہ مقصد پورا ہو جائے۔ اس کے سفر حیات کے لئے جو منزل مقرر کی گئی ہے، یہ اُس منزل و منتہیٰ تک پہنچ جائے۔

انسان اور حیوان میں فرق:

انسان اور دیگر حیوانات کی تخلیق میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دنیا کے ہر حیوان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے، وہ از خود وہ کچھ بن جاتا ہے، اس کے لئے اسے نہ کسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، نہ سعی و کاوش کی حاجت۔ فطرت نے اس کے اندر جو کچھ بننے کے امکانات رکھے ہیں، وہ امکانات از خود بتدریج، مشہود ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک عمر تک پہنچ کر، وہ حیوانی بچہ،

اپنی نوع کا مکمل فرد بن جاتا ہے۔۔۔شیر کا بچہ شیر بن جاتا ہے۔بکری کا بچہ بکری۔لیکن انسانی بچے میں فطرت نے جو مضمر صلاحیتیں رکھی ہوتی ہیں، اُن کی دو قسمیں ہیں۔ایک حیوانی یا طبیعی صلاحیتیں۔یہ دیگر حیوانات کی طرح از خود نشوونما پا کر، ایک منتہیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔اور وہ بچہ بالآخر 'آدمی' بن جاتا ہے۔دوسری صلاحیتیں انسانی ہیں۔یہ از خود نشوونما نہیں پاتیں۔انہیں مناسب تعلیم و تربیت سے نشوونما دے کر اجاگر کرنا ہوتا ہے۔

مومن:

قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جس سے فرد کی وہ مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پا کر مشہود ہو جاتی ہیں اور پھر وہ انہیں ان مقاصد کے لئے صرف کرتا ہے جو اس کے لئے متعین کئے گئے ہیں۔جب وہ اس مقام پر پہنچ جائے گا کہ انسان وہ کچھ بن گیا جو کچھ بننا اس کے لئے مقصود و مطلوب تھا۔قرآن نے ایسے فرد کو مردِ مومن کہہ کر پکارا ہے۔اور انسان کی اس ہیئت کو ''احسن تقویم'' قرار دیا ہے (95/4)۔یعنی ایسی ہیئت جو حسن و توازن میں انتہا تک پہنچ گئی ہو۔۔۔جن خصوصیات کے مظہر یہ افراد ہوں انہیں صفاتِ مومنین کہا جاتا ہے۔اور جب یہ خصوصیات محسوس شکل میں سامنے آئیں تو انہیں ''اعمالِ صالح'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یعنی ایسے کام جو اس فرد کی بھرپور انسانی صلاحیتوں کے اثمار و نتائج ہوں۔اور جن سے عالمِ انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہو، اسے قرآن نے: ۔خَيْرَ أُمَّةٍ (3/109)۔''بہترین قوم جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے'' قرار دیا ہے اور: أُمَّةً وَسَطًا (2/142)۔

''یعنی ایسی قوم جسے عالمِ انسانیت میں مرکزی حیثیت حاصل ہو'' کا مقام دیا ہے۔۔۔سطحی نظر سے دیکھئے تو معاشرہ، جماعت یا اُمت، افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے۔لیکن اجتماعی نفسیات پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ جماعت، افراد کی حاصل جمع (Sum Total) کا نام نہیں ہوتی۔اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔

اُمت کی خصوصیات:

اس لئے قرآن، افراد کی خصوصیات کے علاوہ، جماعتِ مومنین کا ذکر بھی خاص طور پر کرتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ افراد کی تعلیم، تربیت اور نشوونما کے علاوہ، ان اصول و ضوابط کی بھی وضاحت کرتا ہے جن کے مطابق ان افراد نے اجتماعی امور سر انجام دینے ہوتے ہیں اور جن کی بناء پر وہ ایک منفرد جماعت بنتے ہیں۔اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآنی تعلیم کی انفرادیت اور بے مثالیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔اور اسی مقام کے سامنے نہ ہونے سے، اچھے اچھے سمجھ دار لوگوں کو بھی یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ ''عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں'' (ترجمان القرآن۔ابوالکلام آزاد مرحوم)۔''عالمگیر سچائیوں'' سے ان کی مراد ہوتی ہے، عام اخلاقی اصول۔مثلاً جھوٹ نہ بولو۔چوری نہ کرو۔کسی کو ستاؤ نہیں۔وغیرہ وغیرہ۔جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہی اخلاقی اصول قرآن پیش کرتا ہے اور یہی تعلیم دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی پائی

جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں کہ ''عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں''۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس اجتماعی نظام میں ان اخلاقی اصولوں کے حامل افراد زندگی بسر کرتے ہیں، اس نظام کے اصول کیا ہیں؟۔

نظام اور فرد:

مثال کے طور پر سمجھئے کہ ایک برہمن جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ انسان تو ایک طرف، کیڑوں مکوڑوں تک کو بھی نہیں ستاتا۔ لیکن جس اجتماعی نظام کا وہ فرد ہے اس کا اصول یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں اس قدر گہرا اور بنیادی فرق ہوتا ہے کہ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ساری عمر دوسروں سے اپنی پرستش کراتا ہے اور شودر کے ہاں جنم لینے والا بچہ، تمام عمر، دوسروں کی خدمت اور بیگار میں بسر کر دیتا ہے۔ اور یہ فرق اس قدر غیر متبدل ہوتا ہے کہ شودر کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے جوہر ذاتی اور اس کی ہزار محنت اور کوشش اس فرق کو مٹا نہیں سکتی۔۔۔۔ آپ کہئے کہ جو معاشرہ اس اجتماعی اصول کے مطابق متشکل ہو، اس میں افراد کی اس قسم کی ''نیکیاں'' کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور چوری نہیں کرتے، کیا خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی ہیں؟۔ افراد کی اس قسم کی ''نیکیاں'' محدود سے انفرادی حلقہ میں قدرے سکون پیدا کر سکتی ہیں۔ لیکن نہ تو یہ انسان کو اس کا صحیح مقام دینے کے قابل بن سکتی ہیں اور نہ ہی عالمگیر انسانیت کی فوز و فلاح کا موجب۔ حتیٰ کہ یہ اُس باطل نظام کو تباہی سے بچا سکنے کے قابل بھی نہیں ہو سکتیں جس کے اندر وہ ''نیک انسان'' زندگی بسر کرتا ہے۔ یا مثلاً جس معاشرہ کا اصول یہ ہو کہ جو بچہ بنی اسرائیل (یہودیوں) کے ہاں پیدا نہ ہو، وہ نجات و سعادت حاصل نہیں کر سکتا، اُس معاشرہ میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور چوری نہیں کرتے، عالمِ انسانیت کے کس کام آ سکتی ہیں؟۔ یا جس معاشرہ میں عقیدہ یہ ہو کہ ہر انسانی بچہ، پیدائشی طور پر گناہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کے گناہوں کا یہ داغ ''خدا کے بیٹے'' (حضرت مسیح) کے کفارہ پر ایمان ہی سے دھل سکتا ہے، اس کے سوا اس داغ کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں، اس معاشرہ میں لوگوں کا رحمدل، حلیم الطبع اور منکسر المزاج ہونا، شرفِ انسانیت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟۔

باطل کا نظام اور انفرادی نیکیاں:

دنیائے مذاہب سے الگ ہٹ کر دیکھئے اور سوچئے! کہ کیا نظامِ ملوکیت میں، ایک بادشاہ کے لئے، جو کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی چلاتا ہے، یہ بات موجبِ فخر قرار پا سکتی ہے کہ اُس نے ساری عمر تہجد قضا نہیں کی یا شراب نہیں پی؟۔ نظامِ سرمایہ داری میں، اگر ایک جاگیردار، زمین دار یا کارخانہ دار، جو ہزاروں محنت کش غریبوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سمیٹ کر لے جاتا ہے، یہ کہتا ہے کہ اُس نے کبھی چوری نہیں کی، تو کیا اسے نیک انسان کہا جا سکتا ہے؟۔ اگر ایک مذہبی پیشوا، جو دن رات عوام کو اس قسم کے عقائد کی تعلیم دیتا رہتا ہے کہ امیری غریبی انسان کی تقدیر سے وابستہ ہے جسے خود خدا نے مقرر کیا ہے اور خدا کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا، اور اس کے ساتھ کہتا ہے کہ اُس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی یہ

انفرادی نیکی، انسانیت کی اجتماعی میزان میں کوئی وزن رکھے گی؟۔ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جن انفرادی اخلاقی خوبیوں کو ''عالمگیر سچائیاں'' کہہ کر اسلام کو مذاہبِ عالم کی صف میں ہم دوش کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، غلط اجتماعی نظام میں ان کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟۔اصل یہ ہے کہ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب، انفرادی ضابطہء اخلاق کا علمبردار ہوتا ہے، اجتماعی نظام سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔اس کے برعکس ''دین'' اجتماعی نظامِ انسانیت کو سامنے رکھتا ہے اور افراد کی اخلاقی خوبیوں کو اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ اس سے اس معاشرہ کا توازن قائم رہے جو عالمگیر انسانیت کی سلامتی اور ارتقاء کا ضامن ہے، اور یوں انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ بن سکنے کا اس میں امکان ہے۔

قرآن کی جامع تعلیم:

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ:۔(1)۔جس معاشرہ میں افراد، عام اخلاقی ضوابط کی پابندی نہیں کرتے، اس معاشرہ میں کسی کو امن وسکون نصیب نہیں ہوسکتا اور خود معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔(2)۔جس معاشرہ میں، افراد عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، لیکن خود معاشرہ، غلط اجتماعی اصولوں پر متشکل ہو، اس میں عام معاشرتی روابط میں تو قدرے سکون حاصل ہوسکتا ہے لیکن نہ تو اس معاشرہ کی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں، اور نہ ہی اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجبِ رحمت بن سکتا ہے۔اور(3)۔جس معاشرہ میں افراد، عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، اور خود معاشرہ بھی صحیح اجتماعی اصولوں کا علمبردار ہو، اس میں، افرادِ معاشرہ کو حقیقی امن وسکون میسر ہوتا ہے۔ان کی طبیعی اور انسانی صلاحیتیں نشوونما پاکر برومند ہوتی چلی جاتی ہیں۔اور اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجبِ فلاح وسعادت ہوتا ہے۔

قرآنی معاشرہ:

قرآن کریم اسی قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں افرادِ معاشرہ عام اخلاقی اصولوں کے شدت کے ساتھ پابند ہوں، اور جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہو، وہ ان مستقل اقدار کا حامل ہو جو عالمگیر انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔اور یہ ہے قرآن کا وہ نظام جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔قرآنی تعلیم اپنی اس خصوصیتِ کبریٰ کی بناء پر بے مثل و منفرد ہے۔قرآن میں مومنین کی ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر اس تفصیل، کثرت اور تکرار سے آیا ہے کہ اس سے افراد کی سیرت وکردار کا صحیح نقشہ اور جماعتِ مومنین (اسلامی معاشرہ) کا بین اور واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔اکثر مقامات پر ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر الگ الگ آیا ہے لیکن بعض مقامات پر ایک دوسرے میں یوں سموئی ہوئی سامنے آتی ہیں جیسے ایک حسین وشاداب شجر طیّب کہ اگر اس کی شاخوں، پتیوں، پھولوں اور شگوفوں کو الگ الگ بھی دیکھا جائے تو پورے کا پورا درخت باعثِ شادابیء قلب ونظر ہو جائے اور اگر، اس سرسبز وشاداب درخت پر بہ ہیئتِ مجموعی نگاہ ڈالی جائے تو اس کی تمام پھول پتیوں کی نزہت ونظافت وجہء نشاطِ روح بن جائے۔'' (جاری ہے)

پروفیسر غازی علم الدین

اعلیٰ سطحی جامعاتی تحقیق کا معیار۔۔۔لمحۂ فکریہ

(پی ایچ۔ڈی کے مقالے ''تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ'' کے تناظر میں)

آج ہر ذی شعور شخص دینِ اسلام کی من مانی تعبیر و تشریح، نظری و فکری انتشار اور مسلکی کلچر سے بے زار نظر آتا ہے۔ برعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں بیسویں صدی عیسوی بہت ہنگامہ خیز رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب استعمار اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں شکست و ریخت کے بعد وہ یہاں سے چلتا بنا، لیکن جاتے جاتے برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کو کئی فتنوں اور صدمات سے دوچار کر گیا۔ مختلف مکاتبِ فکر، مسلکوں اور مذہبوں نے جڑ پکڑی، جس کے نتیجے میں مسلم معاشرے کے اندر دینِ اسلام کی من مانی تعبیر، تعصب، نفرت اور تفرقے کا زہر گھول دیا گیا۔ دین کے نام پر قائم کیے گئے مدارس میں سے تحمل، بردباری، وسعتِ نظری اور تحقیقی رویّے دم توڑتے چلے گئے۔ مساجد کے اندر مواعظ و خطبات نے تحقیقی اندازِ فکر کے بجائے مناظرانہ رنگ پکڑا۔ تردیدی، تنقیصی اور تکفیری رویوں کو جلا ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کی غالب اکثریت اس پُراثر فریب کے جال میں پھنس گئی۔

افسوس کا مقام ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اعلیٰ سطحی تعلیمی اداروں، بالخصوص حکومتی سرپرستی میں قائم یونیورسٹیوں میں تعصب کی حکمرانی رہی۔ وہ معیار کی معراج، وسعتِ فکر و نظر، غیر جانب داری اور اعلیٰ ظرفی کے اعزاز کو برقرار نہ رکھ سکے۔ جامعات میں کیا جانے والا بیش تر اعلیٰ سطحی تحقیقی کام اپنے معیار، استناد اور نتائج کے اعتبار سے پست رہا ہے۔ معارفِ اسلامیہ کے شعبے ہی کو لے لیجیے، پی، ایچ، ڈی کی سطح کے بیش تر تحقیقی مقالات، موضوعات کے انتخاب کے حوالے سے محلِ نظر ہیں۔ اصولِ تحقیق اور قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے محض اپنے نقطۂ نظر، فکر، مسلک اور من پسند شخصیت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ اپنے مخالف نقطۂ نظر، فکر، مسلک اور شخصیت کی تنقیص کی جا رہی ہے۔ حالت باینجا رسید کہ تحقیق اور مناظرے میں تمیز اٹھ گئی ہے۔

اس تحریر کو اپنے قارئین تک پہنچانے کا محرک پچھلے چند ماہ سے راقم کے مطالعے میں رہنے والا دو ضخیم جلدوں میں، باریک کتابت میں لکھا ہوا A-4 سائز کے 1372 صفحات پر مشتمل پی، ایچ، ڈی کا بسیط مقالہ ہے۔ مقالے کا عنوان ''تفسیر

مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ'' ہے۔ مقالہ نگار جناب حافظ محمد دین قاسمی ہیں۔ مقالے کے نگران پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی مرحوم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اس مقالہ کی تکمیل پر جناب حافظ محمد دین قاسمی کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ، لاہور نے اس تحقیقی مقالے کو بغیر کسی تبدیلی کے تمام تر خصائص و نقائص کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حافظ محمد ادریس ڈائریکٹر ادارہ معارفِ اسلامی نے دو صفحوں پر مشتمل پیش لفظ کا اضافہ فرمایا ہے۔

تفسیر ''مطالب الفرقان'' جناب غلام احمد پرویز کی تخلیقی اور فکری کاوش ہے۔ مقالہ نگار حافظ محمد دین قاسمی نے جناب غلام احمد پرویز کے نظریات کا محاکمہ اور ابطال کیا ہے۔ راقم الحروف اپنی اس تحریر میں جناب غلام احمد پرویز کی شخصیت اور فکر کے بجائے محض مقالے کے معیار، اسلوب، پاکستان مخالف نظریات، کانگریس کی ہم نوائی، قائداعظم شکنی اور مقالے میں برتی جانے والی زبان پر بحث کرنا چاہتا ہے۔ راقم اپنے بارے میں پیدا ہونے والی کسی غلط فہمی سے بچنے کے لیے حدیثِ رسول ﷺ کی بابت اپنے عقیدے، نظریے اور فکر کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ راقم الحروف کا عقیدہ ہے کہ اگر ہم سنت اور حدیث (مستند اور صحیح ہو۔ قرآن کی روح اور متن کی نقیض نہ ہو) سے دست کش ہو جائیں تو دینِ اسلام کی بلند و بالا عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔

جناب پرویز کے حدیث مخالف افکار کے جواب میں معاصر علماء نے اپنی طرف سے دین کی درست تعبیر و تشریح کرنے کی کوشش کی اور پرویز کے فکر کے مقابل ایک توانا دینی ادب تخلیق ہوا۔ حافظ محمد دین قاسمی کی طرف سے جناب پرویز کی تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ اس دینی ادب میں ایک اضافہ ہے۔ مقالہ نگار نے پرویز صاحب کے افکار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اُسے اعتراف ہے کہ:

> ''جناب پرویز کی عبارت کی دل کشی، اسلوبِ نگارش کی شگفتگی، الفاظ کی جاذبیت اور ادب کی چاشنی پر مشتمل ان کا لٹریچر اس (مصنف) کی آنکھوں کے لیے وجہِ جاذبیت اور قلب و دماغ کے لیے باعثِ مسحوریت بن گیا۔'' (ص:23)

مقالہ نگار جناب پرویز سے یک گونہ متاثر ہوا لیکن تقابلی مطالعہ کے بعد اپنی رائے کو تبدیل کر لیا۔ جناب پرویز کے فکر کے رد کی بابت مقالہ نگار کی نیت، محنت اور جذبہ قابلِ قدر ہے۔ ان کا مؤقف بھی بہت حد تک درست ہے لیکن اس کام کو پرکھنے، جانچنے اور اس کے معیار کو متعین کرنے میں کسی نقاد اور تجزیہ کار کا پیرامیٹر عام قاری سے ہٹ کر ہوگا۔ مقالہ نگار کے کام، اسلوب اور ذہنی پرداخت کے حوالے سے فنی، تحقیقی، ادبی، نظریاتی اور اخلاقی سطح پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہیں فاضل مقالہ نگار اسے کسی اور رنگ میں نہ لے لیں۔ ان کے کام میں محلِ نظر مقامات کی ایک

طویل فہرست بنتی ہے جس کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیے لیکن یہاں مشتے از خروارے کے طور پر چند ایک کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مصنف کا دعویٰ ہے کہ حکومت پاکستان جناب پرویز کے نظریات کی سرپرستی کرتی رہی اور سرکاری سطح پر فکر پرویز کی اشاعت ہوتی رہی۔ پیش لفظ میں حافظ محمد ادریس (ڈائریکٹر ادارہ) نے بھی یہی دعویٰ کیا ہے:

''انگریزوں نے اپنے جانے کے بعد مسلمان ملکوں میں اپنے فکری شاگردوں کو مسلط کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کے مطابق پاکستان میں بھی، آزادی کے بعد، گورے انگریزوں کی جگہ کالے انگریزوں کی حکومت رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام سے منحرف ہر کردار کو حکومتی سرپرستی حاصل ہوتی چلی گئی، تاکہ وہ اہلِ حق کے مقابلے پر حکومت کی ہاں میں ہاں ملائے اور اسے فکری و نظری معاونت فراہم کرتا رہے۔ اس کے بدلے میں حکومتوں نے ان فتنہ پرداز عناصر کی بھرپور سرپرستی کی۔ غلام احمد پرویز کی مسموم فکر سرکاری سرپرستی و وسائل ہی کی بدولت امت کے اندر سرایت کرتی رہی۔ ہر روشن خیال حکمران کو پرویزی نظریات اپنی سوچ اور مفادات کے قریب تر نظر آئے اور انہوں نے بھی کبھی بلند آہنگ انداز میں اور کبھی دھیمے سروں میں اس فتنے کی آبیاری کی۔'' (ص:21)

ان ہر دو فاضلوں کو اپنے دعویٰ میں کوئی تو ثبوت پیش کرنا چاہیے تھا کہ کیا کسی حکومت نے جناب پرویز کے لٹریچر کو سکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر نصاب کا حصہ بنایا؟ الیکٹرانک میڈیا پر فکر پرویز کی تشہیر کی گئی؟ یا سرکاری پرنٹ میڈیا فکرِ پرویز کا ترجمان رہا ہے؟ مذکور اقتباس میں بیان کی گئی سوچ کے اس انداز میں حقیقت کے بجائے بدگمانی اور تعصب غالب ہے۔ زبان اور لب ولہجہ بھی تحقیقی آداب کے منافی ہے۔ کالے انگریزوں۔۔۔ فتنہ پرداز عناصر۔۔۔ مسموم فکر اور روشن خیال حکمران۔۔۔ جیسی تراکیب اور اصطلاحات کسی محقق کی زبان اور قلم کو زیب نہیں دیتیں۔

بات اگر پیش لفظ ہی سے شروع کی جائے تو کسی بھی نقاد، تجزیہ نگار اور محقق کو جناب حافظ محمد ادریس (پیش لفظ نگار) کا یہ جملہ علمی اور متوازن سطح پر محسوس نہیں ہوگا:

۔۔۔''مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح اس (پرویز) نے بھی کئی پینترے بدلے۔ اس نے کئی جنم لیے اور ہر جنم کے ساتھ اس کی کینچلی تبدیل ہوتی چلی گئی۔'' (ص:21)

تحقیقی بیان میں یہ لب ولہجہ غیر علمی اور اعتدال سے ہٹ کر ہوتا ہے اور پھر فاضل پیش لفظ نگار کی اپنی تحریر کے ذریعے نامناسب محاورے کے استعمال سے ایک باطل نظریے (ایک سے زیادہ جنم کا تصور) کا پرچار ہو رہا ہے۔ پیش لفظ نگار کا حافظ

محمد دین قاسمی (مقالہ نگار) کو ''عظیم سکالر'' (ص:22) کہنا جہاں غُلو کی حدوں کو چھونے کے مترادف ہے وہاں علمی انکسار کے بھی منافی ہے۔

تحریکِ آزادی کے حوالے سے مقالہ نگار کا موقف، رائے اور واقعاتی احصاء سبھی محلِ نظر ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ اور تحریکِ آزادی کے بارے میں مقالہ نگار کا اپنا مطالعہ سطحی ہے۔ جناب مقالہ نگار کی کئی واقعات کی حقیقت تک رسائی نہیں ہوسکی۔ سرسیّد احمد خان کے بارے میں ان کی یکطرفہ رائے تحقیقی رویے کے منافی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسیّد احمد خان کے اجتہادی فکر سے کھل کر اختلافِ رائے کیا جاتا رہا ہے۔ قرآنی مسائل کے حوالے سے ان کی بعض تاویلات مسلم اُمہ کے لیے قابلِ قبول نہیں رہی ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں کافر یا مرتد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مسلمانوں کے لیے ان کی دینی، سیاسی، اصلاحی اور تعلیمی خدمات ایک اٹل حقیقت ہیں۔ مقالہ نگار کا علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے خلاف یکطرفہ طور پر فتویٰ بے جا ہے۔ سرسیّد وہی مردِ دانا ہے جس کے بنائے ہوئے تعلیمی اداروں میں داخل ہونے والوں کے ماں باپ کے نکاح ٹوٹ جایا کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان اداروں سے فاضل مقالہ نگار جیسے لوگ پڑھ کر نکلے اور آج اپنا کماتے کھاتے ہیں، بحمداللہ دین دار بھی ہیں اور مدارس کی خدمت بھی کرتے ہیں۔

جناب مقالہ نگار نے بین السطور جمعیت علماء ہند کے کانگریس کی ہمنوائی کے مؤقف کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوقومی نظریہ، مسلم لیگ، تحریکِ پاکستان اور قائداعظم محمد علی جناح کے حوالے سے ان کی سوچ اور رائے پہلے سے طے شدہ ہے۔ اس بابت ان کے تعصب کا اظہار تحقیقی اسلوب اور رویے کے منافی ہے۔ اسلام کے بارے میں قائداعظم کے مطالعے اور معلومات کو بغیر کسی پیرامیٹر کے متعصّبانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قائداعظم کے مطالعہ اور فقہی علم کے بارے میں مقالہ نگار کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر قائداعظم کا اسلام کے بارے میں مطالعہ سطحی ہوتا تو وہ دوقومی نظریے پر زور نہ دیتے۔ قانون وقف علی الاولاد کا مقدمہ نہ جیتتے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لاء کے عالم تھے۔ وہ عملاً کسی بھی فرقے سے وابستہ نہیں تھے۔ اثنا عشری مسلک کے بجائے ان کا رجحان مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد عثمانی اور دیگر کئی علماء اور مشائخ کی طرف تھا۔ ان کی نماز جنازہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ کسی بھی فرقے (بشمول اثنا عشری) نے اعتراض نہیں کیا تھا کہ اہل السنّت والجماعت کے عالمِ دین نے نماز جنازہ کیوں پڑھائی۔

قائداعظم محمد علی جناح کا ذکر کرتے ہوئے مقالہ نگار کے لب و لہجے سے تضحیک چھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ ''قائداعظم اور پرویز۔۔۔ باہمی تعلقات'' کے عنوان سے ساری بحث (ص:87 تا 90) تعارض و تناقض کا شکار ہے۔ ان کی تحقیق کے بعض حصے بعض کے نقیض ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

''قائداعظم اگرچہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے لیکن اسلام کے متعلق ان کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر تھا۔'' (ص:87)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''البتہ انگریزی زبان کو وہ خوب سمجھتے، جانتے، بولتے اور لکھتے تھے۔ قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کا جو مطالعہ انہوں نے کیا تھا وہ اسی زبان کے ذریعے کیا تھا۔'' (ص:87)

یعنی اسلام کے بارے میں قائداعظم کے مطالعہ کی نفی بھی کرتے ہیں اور انہیں یہ بھی اقرار ہے کہ قائداعظم نے انگریزی زبان میں قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ مقالہ نگار کی سوچ سے تحریکِ پاکستان، قائداعظم اور دو قومی نظریہ کے بارے میں ان کا ذہنی انتشار اور تعصب کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اسلام کی بنیاد پر تحریکِ پاکستان کو مؤثر حیثیت دینے کے لیے اور پبلک کا سامنا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ نہ صرف اسلام کا نام لیا جائے بلکہ اس کے بارے میں کچھ معلومات بھی بہم پہنچائی جائیں۔'' (ص:87)

مقالہ نگار کی علمی خیانت ان کے پورے تحقیقی منصوبے کو بے وقعت کر دیتی ہے۔ تحریکِ آزادی اور قائداعظم پر گراں قدر لٹریچر تخلیق ہو چکا ہے۔ قائداعظم کی ذاتی اور سیاسی زندگی پر درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریز حتیٰ کہ ہندو مصنفین نے بھی ان کی سیاست، دیانت، فراست اور اعلیٰ کردار کو دل کھول کر سراہا ہے۔ لیکن مجال ہے کہ مصنف نے ان میں سے کسی کتاب کا حوالہ دیا ہو۔ حوالہ کیسے دے سکتے ہیں کہ اس بابت ان کا دامنِ مطالعہ تو بالکل تہی ہے۔ انہوں نے اپنا تعصب، نفرت اور ذہنی انتشار صفحۂ قرطاس پر انڈیل دیا ہے۔ مقالہ نگار کے علم میں ہونا چاہیے کہ تحریکِ آزادی، مسلم لیگ اور قائداعظم پر مشتمل برسوں کا تاریخی ریکارڈ تقریباً ستر ہزار سفحات کی تعداد میں اپنی اصل حالت میں نیشنل آرکائیو اسلام آباد میں محفوظ ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں تاریخ کے اساتذہ طلبہ، محققین اور مصنفین اس ریکارڈ سے استفادہ کر چکے ہیں۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کے حوالے سے اب کوئی بات اخفاء میں نہیں رہی۔ خود ساختہ تعصّبات کو پالنے اور پھیلانے سے بہتر ہے کہ اپنے مطالعہ کو وسعت دے کر حق بات تک رسائی حاصل کی جائے۔

تحقیق کی زبان اور اسلوب سراسر علمی ہوتا ہے۔ اس میں کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کر کے حقیقت تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ مناظرہ تحقیق کی ضد ہے لیکن مقالہ نگار کا انداز، زبان اور اسلوب سو فی صد مناظرانہ ہے۔ ان کے اپنے جذبات، پسند و ناپسند اور فکر کتاب کے لفظ لفظ سے ٹپک رہے ہیں۔ غلام احمد پرویز کو ''واوین'' کے حصار میں بند کر کے ہر جگہ

نام کے بجائے ''مفکر قرآن'' لکھا ہے۔ یہ تضحیک کسی طور پر بھی تحقیق کو گوارا نہیں ہوتی۔ اس تحقیقی مقالے کے کچھ عنوانات بھی ملاحظہ فرمایئے جس سے مقالہ نگار کے نفسیاتی اور ذہنی خلجان کو سمجھنے میں مدد ملے گی:

''جھوٹ سوفی صد جھوٹ''۔۔۔''سوال گندم جواب چنا''۔۔۔''اخلاقی نامردی''۔۔۔''پرویزی حیلے''۔۔۔''مفکر قرآن کا دورِ خاپن''۔۔۔''مفکر قرآن کی چال بازی''۔۔۔''علی گڑھ سیلابِ مغربیت کا دروازہ''۔۔۔پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا''۔۔۔''خارزارِ تضاداتِ پرویز''۔۔۔''زعماءِ مسلم لیگ کی جان کو دوگونہ عذاب''۔۔۔''ایک عذرِ لنگ کا سہارا''۔۔۔''مفکر قرآن کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری''۔۔۔''مفکر قرآن کی سخن سازی''۔۔۔اور''مفکر قرآن کا خاصہ مزاج''۔

اعلیٰ سطحی جامعاتی تحقیق کے لیے نہ تو یہ اسلوب ہے اور نہ ہی اس کی اجازت۔

جناب مقالہ نگار شدتِ جذبات میں اپنی زبان نامناسب حد تک لے جاتے ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

''وہ اس تلخی اور غلاظت کے ساتھ برستے ہیں کہ عام قاری بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ شاید ان کے منہ میں زبان نہیں بلکہ بچھو کا ڈنک ہے۔'' (ص:684، جلد: دوم)

مقالہ نگار کا پست زبان سے اپنے ذہن اور زبان کو آلودہ کرنا بھی ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اسے اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ انسان کے اندر وہبی طور پر موجود ذوقِ سلیم اور اخلاقی تربیت انسانی مزاج اور طرزِ فکر کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ پڑھے لکھے اور باشعور آدمی کا طرزِ کلام وہ نہیں ہوتا جو ان صفات سے عاری لوگوں کا ہوتا ہے۔ ایک عام آدمی کوئی غیر معیاری لفظ بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنی زبان سے نکال سکتا ہے مگر ایک مہذب آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔

''حرف آخر۔۔۔خلاصۂ مقالہ'' میں رقم طراز ہیں:

''وہ نہ تو صحتِ عقائد اور سلامتی فکر ہی کا حامل ہے اور نہ تقویٰ و دیانت کا جوہر اس کے طرزِ عمل میں پایا جاتا ہے۔'' (ص:725، جلد: دوم)۔

مقالہ نگار نے غلام احمد پرویز کے لیے ''عقائدِ فاسدہ''، ''افکارِ زائغہ''، ''تندمزاج''، ''غیر متوازن شخصیت'' اور ''کبرِ نفس کا شکار'' جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مانا کہ غلام احمد پرویز اپنے افکار کی بدولت ایک طبقے کے نزدیک ناپسندیدہ شخصیت ہیں لیکن اس کے باوصف مقالہ نگار کو مناظر کے بجائے محقق کا لب ولہجہ اپنانا چاہیے تھا۔ غصہ، تعصب اور نفرت کے اظہار سے قابلِ قدر تحقیقی کام بھی مشکوک اور محلِ نظر بن جاتا ہے۔

اس تحقیقی منصوبے میں مقالہ نگار کی شخصیت اور فکر کا ایک انتہائی خطرناک بلکہ خوف ناک پہلو عیاں ہوتا ہے۔ مسلکی تعصّبات

اور عدمِ رواداری کے رویّے مقالہ نگار کی نفسیاتی بیماری اور ذہنی خلفشار کو طشت از بام کرتے ہیں۔ وہ فقہی تقلید کے سخت خلاف ہے لیکن شدت جذبات میں وہ آئمہ کبار اور مغربی مفکرین کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے ان سے اظہارِ بے زاری کرتا ہے:

''قارئین کی نگاہیں خود دیکھ لیں گی کہ مقالہ نویس جس طرح امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام داؤد ظاہریؒ اور سفیان ثوری وغیرہم کی تقلید سے بے زار ہے بالکل اسی طرح وہ کارل مارکس، لینن، ہیگل، ڈارون اور برگساں جیسے ملاحدہ کی تقلید سے بھی سخت بے زار ہے''

(ص:28، جلد:اوّل)

اس جملے کی ترکیب سے مذکور آئمہ کبار بھی اِلحاد کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ خاکم بدہن اس سے تو مقالہ نگار کی دریدہ دہنی ثابت ہوتی ہے۔

مقالہ نگار نے غلام احمد پرویز کو دیانتداری سے پورٹریٹ نہیں کیا۔ جناب غلام احمد پرویز کو کافر، مرتد اور متنبّی قرار دے کر مقالہ نگار نے نہ تو احتیاط کے تقاضے نبھائے ہیں نہ ہی علمی و تحقیقی رویے کی پاس داری کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ جناب پرویز کو فکری اعتبار سے گمراہ قرار دیا جاسکتا ہے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جاسکتا۔

فنی اعتبار سے اس کتاب کا جائزہ لیا جائے تو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ جامعاتی سطح پر ایجاز و اختصار تحقیق کا جوہر ہوتا ہے۔ مصنف ایجاز و اختصار کے ہنر اور تحقیقی مواد کے حسنِ استعمال کے فن سے متصف نہیں ہے۔ دست یاب ہونے والے سبھی مواد کو اختصار اور سلیقہ کے بغیر دو ضخیم جلدوں میں بھر دیا ہے۔ تحقیق نگاری میں اِملائی اغلاط کا عیب تحقیقی معیار کو گرا دیتا ہے۔ اس مقالے میں شروع سے آخر تک اغلاط کے ایسے نمونے اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

بشکریہ:

1۔ شش ماہی ''التفسیر'' جلد:7، شمارہ نمبر 22، جولائی، دسمبر 2013ء مجلس التفسیر، یونیورسٹی کیمپس، جامعہ کراچی، کراچی۔

2۔ شش ماہی ''ایام'' جولائی۔ دسمبر 2013ء مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ و ثقافت، جامعہ کراچی، کراچی

3۔ سہ ماہی ''لوحِ ادب'' جلد 16، شمارہ 1 تا 3 (جولائی 2013ء، مارچ 2014ء)، کراچی/ حیدرآباد۔

(کتاب: تنقیدی و تجزیاتی زاویے، مصنف: پروفیسر غازی علم الدین، پبلشر: بزمِ تخلیق ادب پاکستان، کراچی سے انتخاب)

سانحہ ارتحال

بزمِ طلوع اسلام منڈی بہاء الدین کے نمائندہ خان محمد خان صاحب کے داماد گذشتہ دنوں انتقال کر گئے، عمر 55 سال تھی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور پس ماندگان، اعزہ و اقرباء کو صبر کی توفیق سے نوازے۔ ادارہ خان محمد خان صاحب اور مرحوم کے تمام لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

وہ اندھا جس نے پُوری قوم کو آنکھیں دیں

شاہ فاروق کی علیحدگی کے بعد جنرل نجیب نے قاہرہ میں اپنے ان فوجی افسروں کا ایک اجتماع کیا جنہوں نے اس انقلاب کی کامیابی کے لیے اس کی مدد کی تھی۔ اس میں اس نے اپنے فوجی رفقاء کے علاوہ ایک غیر فوجی کو بھی مدعو کیا۔ یہ تھا طٰہٰ حسین، 64 سالہ مصنف اور ماہر تعلیم، نجیب نے طٰہٰ سے کہا کہ وہ اس اجتماع سے خطاب کرے۔ یہ بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا اور مجمع سے کہا کہ:

> ''محض ڈسپلن اور نظم وضبط کافی نہیں، وہ حکومت جو نظم وضبط تو قائم کرے لیکن آزادی کو ختم کر دے وہ انہی کی طرح ہے آج جو روس میں فولادی پردے کے پیچھے ہیں۔ جہاں ایک انسانی فرد کو چیونٹی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔''

ڈاکٹر حسین اس نقطہ کو واضح کرتا چلا گیا اور جب اس نے اپنی تقریر کو ختم کیا تو کمرہ میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ فوجی افسر ایسے بھی تھے جنہوں نے ان خیالات کو چنداں وقعت نہیں دی لیکن جنرل نجیب اٹھا اور طٰہٰ حسین کو گلے سے لگا لیا اور اپنے رفقاء کی طرف دیکھ کر کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب طٰہٰ حسین کے ان الفاظ کو اپنے دل میں جگہ دیں، یہ الفاظ ہماری تحریک کا سنگ بنیاد ہیں۔

طٰہٰ حسین مشرق وسطیٰ میں گذشتہ تین سال سے جہالت اور استبداد کے خلاف مصروف جدوجہد ہے۔ مصر سے ملوکیت کو ختم کرنے میں اس کی کوششیں کسی دوسرے سے کم نہیں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے ملک میں تقریر وتحریر کی آزادی کی قدر و قیمت کو ایک ایک سے منوالیا ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر اس کا معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ مصر کے ایک ایک بچہ کی مفت تعلیم کا انتظام کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو کسی دوسرے عرب ملک کو ابھی تک نصیب نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر حسین نے یہ سب کچھ ایک ایسے مانع کی موجودگی میں کیا ہے جو دوسروں کو خود اپنی روٹی کے لیے بھی غیروں کا محتاج بنا دیا کرتا ہے۔ وہ تین برس کا بچہ تھا کہ بالکل اندھا ہو گیا اور اس وقت سے آج تک بینائی سے محروم ہے۔ لیکن اس نے عمر بھر اس بات کو تسلیم ہی نہیں کیا کہ بینائی سے محرومی انسان کے راستہ میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے۔ ابھی حال ہی کا ذکر ہے

کہ جب اس کے ایک دوست نے اس سے کہا کہ بینائی کا نہ ہونا آپ کے راستہ میں کتنی بڑی رکاوٹ ہے تو طٰہٰ حسین نے مسکرا کر کہا کہ آپ اسے رکاوٹ کہتے ہیں اور میں تو اسے ایک نعمت تصور کرتا ہوں۔ کتنی بے معنی اور غیر مفید جاذبیتیں ہیں جو آنکھوں کے نہ ہونے کی وجہ سے میرے ذہن کو اپنی طرف کھینچ ہی نہیں سکتیں۔

منہنی جسم، متوسط قد، پاکیزہ خط وخال، سفید بال، شستہ مغربی لباس، سیاہ چشمہ یہ ہے ڈاکٹر طٰہٰ حسین جس کے قریب جانے سے فوراً جنبیت ختم ہوجاتی ہے اور چند ہی لمحوں میں اس کے قہقہے فضا میں گلفشانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

طٰہٰ حسین ایک غریب کسان کا لڑکا تھا جس کے تیرہ بچے تھے وہ شمالی مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہ ابھی تین ہی سال کا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے بھائی بہن جن چیزوں کا ذکر کرتے ہیں وہ اسے دکھائی نہیں دیتیں۔ یعنی تین برس کی عمر میں اس کی بینائی جاتی رہی اور یہ چیز صرف طٰہٰ حسین کے ساتھ ہی واقع نہیں ہوئی۔ مصر کی دیہاتی آبادی کے قریب پچاس فیصدی بچوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ لیکن طٰہٰ حسین نے سڑک پر بیٹھ کر بھیک مانگنے کے بجائے مکتب کا رخ کیا۔ تھوڑے سے عرصہ میں اس نے قرآن حفظ کرلیا اور جو کچھ مکتب میں پڑھایا گیا اس میں یہ اپنے ہم سبق بچوں میں سب سے آگے تھا۔ اس کی ذہانت کی بنا پر اسے مزید تعلیم کے لیے شہر میں بھیج دیا گیا جہاں اس نے جامعہ ازہر میں اپنی شاندار کامیابی کی بنا پر وظیفہ حاصل کیا۔ 1914ء میں اس نے اسی یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی یہ سب سے پہلی ڈگری تھی جو اس یونیورسٹی کی طرف سے کسی کو ملی تھی۔ اس کی بے مثال ذہانت اور فطانت کی بنا پر اسے پیرس بھیج دیا گیا جہاں اس نے پی، ایچ، ڈی کی ایک اور ڈگری حاصل کرلی اور اس کے ساتھ ہی ایک فرخندہ جبین فرانسیسی بیوی بھی جس کے ساتھ اس نے 1918ء میں شادی کی۔

وطن میں واپسی پر وہ قاہرہ یونیورسٹی میں عربی ادب کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے پہلے ہی دن اپنے طالب علموں کو یہ سبق دیا کہ وہ کسی معاملہ میں تقلید نہ کریں بلکہ ہر مسئلہ کا مطالعہ آزادانہ کریں۔ یہ تصور مصر کی فضا میں یکسر غیر مانوس اور ایک قسم کی بہت بڑی بدعت تھا۔ وہاں تو سکھایا یہ جاتا تھا کہ جو کچھ تمہیں اسلاف سے ملے اسے آنکھیں بند کرکے قبول کرتے چلے جاؤ اس لیے کہ ؎

خطائے بزرگان گرفتن خطا است

حتیٰ کہ وہ توہم پرستانہ افسانے جن کے متعلق بادی النظر میں معلوم ہوجائے کہ وہ محض ذہن انسانی کے تراشیدہ ہیں، انہیں بھی ابدی حقیقت سمجھا جائے۔ طٰہٰ حسین نے اس باب میں ایک کتاب لکھی جس میں پوری پوری تحقیق کے بعد بتایا کہ اس قسم کے تمام معتقدات محض افسانے ہیں جنہیں اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کتاب نے (جیسا کہ ہر مُلّا زدہ ملک میں ہونا چاہئے) مصر کی فضا میں ہیجان پیدا کردیا اور طٰہٰ حسین کے خلاف اس قدر شور اٹھا کہ حکومت کو ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنا پڑا۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور دیانتداری پر مبنی لیکن اس کے باوجود پارلیمنٹ میں ایسا قدامت پسند طبقہ موجود تھا جو اس پر زور دیتا تھا کہ اس کتاب کو ضبط کیا جائے۔ اس مسئلہ نے پارلیمنٹ میں بھی طوفان برپا کر دیا وزارت کی طرف سے طٰہٰ حسین کی تائید ہوتی تھی لیکن مخالف طبقہ نے حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کر دی آخرالامر طٰہٰ حسین کو کامیابی ہوئی اور اس سے نہ صرف یہ کہ اس کی کتاب ضبط نہ ہوئی بلکہ مصر میں پہلی مرتبہ تحریر و تقریر و فکر کی آزادی کو تسلیم کیا گیا۔

1930ء میں طٰہٰ حسین قاہرہ یونیورسٹی کا ریکٹر منتخب ہوا۔ اس کی صاف گوئی اور حریت پسندی کی وجہ سے مصر کا وزیراعظم اسماعیل صدقی، اس کا سخت مخالف ہو گیا اور اس سے کہا کہ یا تو وہ یونیورسٹی میں حکومت کے خلاف تنقید کو بند کرے یا اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائے۔ طٰہٰ حسین نے بہتر یہ سمجھا کہ وہ وزیراعظم کو سمجھائے کہ وہ غلطی پر ہے لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی، طٰہٰ حسین نے اپنی تنقید کو بدستور جاری رکھا اور یونیورسٹی کے معاملات میں حکومت کی دخل اندازی کے خلاف ہمیشہ احتجاج کرتا رہا۔ حکومت سے اس تصادم کی وجہ سے طٰہٰ حسین بڑی مشکلات میں پھنس گیا۔ ادھر اس کا ایک بچہ ایسا بیمار ہوا کہ اس کے پاس جو کچھ پونجی تھی وہ اس کے علاج میں صرف ہو گئی اور اسے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے قرض مانگنا پڑا۔ اس نے مسلسل تین سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی۔ مختلف نوعیتوں کی جسمانی اور ذہنی جراحتیں برداشت کیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات فرشتہ اجل کے دبے پاؤں کی آہٹ کو بھی سنا۔ لیکن اس سے نہ اس کے عزم میں فرق آیا نہ کام کی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی۔ اس تین سال کے عرصہ میں اس نے سات گراں بہا کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان میں سے بعض کتابیں مصر میں ضبط کر لی گئیں لیکن ان سے اس کی شہرت تمام مشرق وسطیٰ میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ آخرالامر 1933ء میں صدقی برطرف ہوا اور طٰہٰ حسین پھر اپنے عہدہ پر بحال کر دیا گیا اور اس کی بحالی کے ساتھ ہی مصر کی تمام درسگاہوں کو آزادی نصیب ہو گئی۔

اس تین سالہ صعوبات کے تجربے نے طٰہٰ حسین پر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ جب تک قوم کے لوگوں میں تعلیم کو عام نہ کر دیا جائے انہیں صحیح جمہوریت نصیب نہیں ہو سکتی چنانچہ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ حکومت کو مجبور کرے گا کہ وہ ملک کے ہر ایک بچہ کے لیے مفت تعلیم کا انتظام کرے۔ مفت تعلیم کا خیال آج کوئی انقلابی خیال تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن اس زمانہ کے مصر میں اور ایک مصر ہی پر کیا موقوف ہے تمام عرب ممالک میں اس قسم کا خیال فی الواقع بہت بڑا انقلابی خیال تھا۔ مفت تعلیم تو ایک طرف، مصر میں ابھی کل تک یہ کیفیت تھی کہ حکومت، پرائمری کے درجہ میں ایک بچہ سے بیس پونڈ سالانہ بطور فیس وصول کرتی تھی حالانکہ بیس پونڈ سالانہ وہاں کے کاشتکار کی سالانہ آمدنی کے برابر تھے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس فیس کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ علم ایسی جنس نہیں جسے منڈیوں میں فروخت کیا جائے۔ یہ سورج کی روشنی اور تازہ ہوا کی طرح

فطرت کا عطیہ ہے جو ہر اس شخص کے لیے مفت کھلا ہونا چاہئے جو اسے حاصل کرنے کی تڑپ اپنے اندر رکھتا ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اس دلیل کا جواب یہ تھا کہ حکومت کے پاس اس قسم کی عیاشی کے لیے روپیہ نہیں۔ لیکن اصل اعتراض اقتصادی نہیں تھا شاہ فاروق اور اس کے حواری اس خطرہ کو محسوس کرتے تھے کہ اگر ملک کے غریب لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تو وہ اپنی موجودہ حالت سے غیر مطمئن ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں طٰہٰ حسین کہتا تھا کہ اس غریب طبقہ کی جو حالت ہے اسے اپنی اس حالت سے غیر مطمئن ہونا چاہئے وگرنہ اس کی اس حالت کی اصلاح ہی نہ ہو سکے گی۔ شروع شروع میں طٰہٰ حسین کی سخت مخالفت ہوئی۔ نہ صرف حکومت کی طرف سے بلکہ پریس کی طرف سے بھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنے اس جہاد کو جاری رکھا۔ اکتوبر 1943ء میں پارلیمنٹ میں سب سے پہلی بار اس فیصلہ کا اعلان ہوا کہ آج سے ملک میں پرائمری تک کی تعلیم مفت دی جائے گی۔

لیکن طٰہٰ حسین اس سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ اس فیس کے بھی خلاف تھا جو حکومت کی طرف سے ثانوی مدارس میں وصول کی جاتی تھی۔ اس نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا تو حکومت نے کہا کہ وہ وزیر تعلیم کے ساتھ بطور مشیر کام کرے اور اس طرح دیکھے کہ اس کا پروگرام کس حد تک قابل عمل ہے۔ اس حیثیت میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے حکومت سے یہ منظور کرا لیا کہ بچوں کو دوپہر کا کھانا اور طبی امداد مفت ملا کرے۔ نیز اس نے الگزنڈریہ یونیورسٹی کی بھی بنیاد رکھی جس میں اس وقت تقریباً آٹھ ہزار طالب علم تعلیم پا رہے تھے۔ 1950ء میں حکومت نے طٰہٰ حسین کی خدمت میں وزارت تعلیم کا عہدہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ میں اس پیش کش کو اس شرط پر قبول کر سکتا ہوں کہ مجھے اس کا پورا پورا اختیار دیا جائے کہ ملک کو جس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے میں اس تعلیم کو رائج کر سکوں۔ چونکہ اس وقت حکومت کو خطرہ تھا کہ اگر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تجویز مخالفت کی گئی تو اس سے بڑی بدنامی ہوگی اور اگر وہ کیبنٹ میں شامل ہو جائے تو اس سے خود کیبنٹ کا مقام بلند ہو جائے گا اس لیے حکومت نے اس کی اس شرط کو فوراً قبول کر لیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ثانوی تعلیم کو مفت کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بل پیش کر دیا کہ سترہ سال کی عمر تک ہر بچہ کو جبری تعلیم دی جائے۔ اس سے پھر ایک طوفان اٹھا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اتنے اسکول اور اتنے اساتذہ کہاں سے آئیں گے۔ طٰہٰ حسین نے کہا کہ اس کا انتظام میں کروں گا۔ اس نے گاؤں گاؤں جا کر مدرسوں کے لیے مکان حاصل کیے اور تھوڑے ہی دنوں میں قریب ڈھائی ہزار مکانوں کا انتظام کر لیا۔ اساتذہ کے لیے اس نے جدید قسم کا ٹریننگ کورس وضع کیا جس سے اس نے اٹھارہ مہینوں میں بارہ ہزار نئے استاد تیار کر دیئے۔ جہاں تک حکومت سے روپیہ حاصل کرنے کا تعلق تھا اس نے حکومت کے اس کمزور پہلو سے خوب فائدہ اٹھایا کہ وہ اپنی نیک نامی کے لیے طٰہٰ حسین کو وزارت میں رکھنا چاہتی تھی۔ طٰہٰ حسین اپنی جیب میں ہر وقت اپنا استعفیٰ رکھتا تھا جونہی کسی مقام پر حکومت روپیہ دینے میں پس

وپیش کرتی وہ جھٹ سے اپنا استعفیٰ نکال کر میز پر رکھ دیتا اسے استعفیٰ بھی واپس مل جاتا اور اس کے ساتھ مطلوبہ روپیہ بھی۔

وزیر تعلیم کی حیثیت میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی بہترین کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں اور مصر کے سینکڑوں نوجوانوں کو امریکہ اور یورپ کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔

لیکن طٰہٰ حسین کے راستہ میں شاہ فاروق ایک سنگ گراں بن کر حائل تھا۔ طٰہٰ حسین کھلے بندوں شاہ فاروق پر اعتراضات کرتا اور کسی جائز تنقید سے کبھی نہ جھجکتا۔ حکومت نے اس کے میگزین کو بند کر دیا تا کہ وہ اپنے خیالات کو پھیلا نہ سکے۔ ایک دفعہ اسے ایک مضمون کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا لیکن عدالت نے اسے تھوڑے سے جرمانہ کی سزا دے کر چھوڑ دیا۔

جنرل نجیب نے شاہ فاروق کے خلاف 1953ء میں جو انقلابی قدم اٹھایا تھا ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا اس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا یہ ایک خالص فوجی اقدام تھا اور اس زمانہ میں طٰہٰ حسین مصر میں موجود بھی نہیں تھا وہ اٹلی میں تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ شاہ فاروق کے خلاف طٰہٰ حسین کی مسلسل کوششوں سے مصر کی فضا اس انقلاب کے لیے بالکل ہموار ہو چکی تھی۔

طٰہٰ حسین آج قاہرہ کے نواح میں ایک سادہ سے مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کی لائبریری میں فرانسیسی، یونانی، عربی زبان کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں جسے کوئی نہ کوئی اسے پڑھ کر سناتا رہتا ہے۔ موسیقی سے اسے خاص شغف ہے وہ اپنا بیشتر حصہ تالیف وتصنیف کے کام میں گزارتا ہے۔ مصر کا ملک جتنے بڑے بڑے اعزازات کسی کو دے سکتا تھا وہ سب ڈاکٹر حسین کو دیئے جا چکے ہیں۔ اپنے ملک سے باہر آکسفورڈ، روم، لیونز اور دوسری بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے اسے آنریری ڈگریاں دی ہیں۔ بلجیم، فرانس اور یونان کی حکومتوں نے اسے خاص عطیے دیئے ہیں۔ ایک دفعہ یہ تجویز بھی ہوئی تھی کہ اسے یونسکو (Unesco) کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا جائے۔ لیکن اس کے ملک نے یہ کہہ کر اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ، مصر کی آنکھوں کو اس اندھے کی بڑی ضرورت ہے۔

آج اس بچپن کے اندھے کے طفیل مصر کی مختلف درسگاہوں میں قریب بیس لاکھ طالبعلم بیک وقت تعلیم کی روشنی سے اپنی آنکھیں منور کرتے ہیں۔

(ماخوذ از ریڈرز ڈائجسٹ)

طلوعِ اسلام: خدا کرے کہ پاکستان کو بھی کوئی اسی قسم کا بالغ نظر اندھا مل جائے جو ان تاریکیوں کو دور کر سکے جو یہاں کے آنکھوں والوں نے اس بری طرح سے پھیلا رکھی ہیں!

(اقتباس از طلوع اسلام، کراچی، 27 اگست 1955ء)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

ماہنامہ ''اشراق'' کے ایک مضمون ''اسلام اور خلافت'' کے حوالے سے

مؤقر ماہنامہ ''اشراق'' پاکستان کا ایک بلند پایہ ماہنامہ ہے۔ اس میں بہت معیاری اور پُرمغز مضامین طبع ہوتے ہیں۔ پاکستان میں ایک بہت بڑے حلقے کا ایک خاص ذہن اس ماہنامہ نے بنایا ہے۔ یہ ماہنامہ مذہب کا داعی ہے۔ مذہب چونکہ خود توہم پرستی اور irrationality پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس کا سارا لٹریچر عموماً توہم پرستی اور غیر عقلی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پاکستان میں ہی تحریکِ طلوعِ اسلام بھی کام کر رہی ہے اور ہر طرف غور و فکر کی لہریں پھیلا رہی ہے۔ ہمارا مذہبی لٹریچر بھی اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ ماہنامہ اشراق اگرچہ مذہب کا داعی ہے لیکن طلوعِ اسلام کی فکر سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہو کر قرآن کے قریب بھی آیا ہے اور مذہب کی بے بنیاد چیزوں کو چھوڑ کر، معقولیت پسندی بھی اختیار کی ہے۔ بعض مرتبہ آدمی غیر شعوری طور پر بھی متاثر ہو جاتا ہے اور خود کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ تحریکِ طلوعِ اسلام نے پاکستان کے مذہبی اور سیکولر دونوں اذہان کو متاثر کیا ہے۔

یہاں تک تو لگا لائے ہیں ہم منزل پہ ناصح کو
کہ سمجھاتا ہوا اب تا درِ میخانہ آتا ہے

اس ماہنامہ کے اگست 2015ء کے شمارے میں جناب ریحان احمد یوسفی صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''اسلام اور خلافت'' شائع ہوا ہے۔ جو ایک قیمتی مضمون ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلافت راشدہ کے انقراض کے بعد سے امت مسلمہ میں سے کسی شخص نے اقامتِ دین کی دعوت نہیں دی۔ یہ سارا تیرہ سو سال کا عرصہ دین کے تصور سے بالکل خالی رہا ہے۔ جناب یوسفی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ کمیونزم کے ردِّعمل میں مولانا مودودی نے حکومت اِلٰہیہ کا تصور پیش کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں ''چنانچہ حکومت الٰہیہ کا نظریہ جس میں صالحین کی ایک جماعت جدوجہد کر کے، اقتدار پر قبضہ کرنے اور پہلے پورے سماج کو بدل دینے اور پھر دنیا بھر پر اسلام کو غالب کر دینے کی علم بردار تھی، کمیونزم کا ایک بہت اچھا متبادل بن کر سامنے آئی۔'' انہوں نے مزید تحریر فرمایا ''اس کے (یعنی کمیونزم) کے جواب میں اسلام کو اسی انداز سے پیش کر کے، مولانا مودودی نے بہرحال بہت سارے لوگوں کو کمیونزم کی آغوش میں جانے سے بچایا'' اگرچہ انہوں نے اپنے مضمون میں مولانا مودودی مرحوم کی بہت تعریف تحریر کی ہے۔ لیکن عملی طور پر ان سے اختلاف کر کے، اور جناب غامدی صاحب سے اتفاق کرتے ہوئے، انہوں نے دین کا مقصد تزکیہ نفس ہی قرار دیا ہے۔ اپنے اس موقف کی تائید میں انہوں نے تین آیات کے تراجم بھی تحریر کئے ہیں۔

انہوں نے ایک پیراگراف میں تحقیر آمیز انداز میں مختصر طور پر محترم پرویز صاحب کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی فکر پر اپنا تبصرہ دینے کی بجائے، انہوں نے مولانا مودودی مرحوم کا تبصرہ تحریر کیا ہے۔ جو مودودی صاحب کے کسی مضمون کی چند سطور پر مشتمل ہے۔ ان سطور کا سیاق وسباق معلوم نہ ہونے کی وجہ سے، ان سطور کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ جو حضرات مذہب کے داعی ہوں گے وہ تحریک طلوعِ اسلام کے نظریات سے اتفاق نہیں کر سکتے اس لئے بھی کہ یہ تحریک قرآنِ خالص کی طرف دعوت دیتی ہے اور یہ بات مذہبی پیشوائیت کو کسی طرح ہضم نہیں ہو سکتی۔

نہ ہمیں اس مضمون سے کوئی تعرض ہے، نہ اس مضمون پر تبصرہ مقصود ہے۔ اس لیے ہم نے اس مضمون میں صرف مخلص تحریر کیا ہے اس مضمون سے کلیۃً صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہم اقامتِ دین اور تزکیہ نفس کے بارے میں تحریکِ طلوع اسلام کا موقف پیش کرتے ہیں، پھر اس موقف کے تناظر میں آپ خود ان دونوں فرائض کے مقام کا تعین فرمالیں۔

اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی ذاتِ عالی صفات، اتنی بلند و بالا وارفع واعلیٰ ہے کہ وہ ہر انسان سے براہِ راست اپنے معاملات طے نہیں کرتا۔ وہ اپنے اور انسانوں کے مابین اپنے منتخب کردہ برگزیدہ انبیاء کرام کو ڈالتا ہے اور ان کے واسطے سے انسانوں سے تعلق قائم کرتا ہے۔ نہ اس کا علم براہِ راست انسانوں کو ملتا ہے (2/118)، (42/52) اور نہ ہی کوئی انسان براہِ راست اس کی اطاعت کر سکتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا علم انبیاء کرام کی معرفت حاصل کرتے ہیں، اور اس کی اطاعت بھی رسولوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان دونوں امور کی وضاحت پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

پہلے اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرنے کی وضاحت عرض کی جاتی ہے۔ مشرکین کے ایک مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے سورہ بقرہ میں ارشاد عالی ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ (2/118)، ترجمہ: جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس مطالبہ کا کوئی جواب یہاں نہیں دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس مطالبہ کا جواب سورہ شوریٰ میں دیا ہے جبکہ ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (42/51) ترجمہ: اور کسی آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعے سے، یا پردہ کے پیچھے سے، یا کوئی فرشتہ بھیج کر غرض وہ اپنے اختیار سے جو چاہتا ہے پیغام بھیجتا ہے بیشک وہ عالی شان حکمت والا ہے۔ ہمارے ہاں جب سے تفاسیر تحریر کرنی شروع ہوئی ہیں اس دن سے لے کر اس قرآنی دور تک، جس میں تحریک طلوعِ اسلام کا آغاز ہوا ہے اس آیت کا غلط ترجمہ اور غلط تفسیر کی گئی ہے اور اس تفسیر میں عملاً ایسے دروازے اور پھاٹک کھلے رکھے گئے اس کہ جن دروازوں سے علم خداوندی براہِ راست انفرادی طور پر حاصل کیا جا سکے۔ اس آیت کی غلط تفسیر کی وجہ سے وحی خفی، الہام، القاء، کشف، استخارہ، تفاول، رویائے صادقہ، کی تصویب کر دی گئی ہے۔ اس تفسیر سے سب سے بڑا

نقصان یہ ہوا کہ اس سے قرآنِ کریم کی اہمیت کم ہوگئی۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں فرقہ بندی ہوئی اور الہام کو اساس قرار دے کر تشیع اور احمدیت دونوں وجود میں آئیں۔ شیعہ حضرات کے ہاں الہام کو حُجّت قرار دیا گیا ہے اور قول امام کو اس طرح حُجّت قرار دیا گیا جس طرح سب مسلمانوں میں قول رسول حُجّت ہے حالانکہ قرآنِ کریم کی رُو سے نہ قول امام حُجّت ہے اور نہ قول رسول (3/159) اب اس آیت کی قرآنی تفسیر پیش خدمت عالی کی جاتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم بھی آیا وہ صرف کلام کے ذریعے الفاظ کی شکل ہی میں آیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی علم بغیر کلام کے نہیں آیا اور کلام کے لیے الفاظ ضروری ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم بھی انسانیت کی طرف آیا وہ صرف الفاظ کی شکل میں آیا۔ جو صرف قرآن میں ہے اور وحی خفی اور الہام میں چونکہ الفاظ نہیں ہوتے اس لیے وہ حصولِ علم الٰہی کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔

اس آیۂ کریمہ میں پوری نوع انسانی تک اللہ کی ہدایت موصول ہونے کا ذکر ہو رہا ہے۔ انسانوں کی دو قسمیں ہیں ایک سول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ تمام نوع انسانی جیسا کہ اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوتا ہے فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (7/6) پھر ہم ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف پیغمبر بھیجے تھے سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔ سورۂ شوریٰ کی مذکورہ آیت کے پہلے حصہ میں رسولوں کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کی ہدایت کس طرح پہنچی ہے۔

رسولوں کو ہدایت ملنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک وہ وحی جبرائیل لاتے تھے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی۔ یعنی جبرائیل کے ذریعے جس کی بابت ارشاد ہے فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (2/97) اور دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہِ راست اس طریقہ سے کہ آواز تو سنائی دے لیکن متکلم دکھائی نہ دے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی طرف وحی ہوئی تھی اور جس کا ذکر سورہ طٰہٰ میں ہے۔

یہ دونوں طریقے انبیاء کرامؑ کے ساتھ مخصوص تھے۔ اب رہے وہ تمام لوگ جن پر تمام نوع بشر مشتمل ہے اور جو رسول نہیں ہیں تو ان کے ساتھ کلام خداوندی کا طریقہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنا ایک رسول بھیجتا تھا اور اس رسول کی معرفت اپنا کلام عام انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ یہ رسول ان کے درمیان واسطہ بنتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تو رسول کے علاوہ کسی بھی بشر سے بات نہیں کرتا اور وحی الٰہی یعنی علم خداوندی بھی انسانوں میں صرف انبیاء کرام کی طرف آتی تھی۔ رسولوں کے علاوہ عام انسانوں کو خدا کی وحی صرف انبیاء کرام کی معرفت ملتی تھی۔

جہاں تک اطاعت خداوندی کا تعلق ہے اس کے متعلق ارشاد ہوا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (4/59) ترجمہ: اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسول کی اور اُن کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تمہارا اختلاف ہو تو اُسے اللہ و رسول کی طرف پھیر دو اور یہی چیز اس بات کی دلیل

ہوگی کہ تمہیں خدا اور آخرت پر ایمان ہے۔ یہ انجام کار تمہارے لیے بہت بہتر ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں دو باتیں غور طلب ہیں جن کے پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے ہماری پیشوائیت سے لغزش ہوئی ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں اگرچہ اللہ و رسول کے دو الفاظ آئے ہیں اور بظاہر یہ دو اطاعتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اللہ و رسول کے الفاظ کو بطور ایک اپنی اصطلاح کے استعمال کیا ہے اور اس کو ایک اطاعت قرار دیا ہے قرآن میں جہاں کہیں بھی یہ اصطلاح آئی ہے۔ ہر جگہ اس کے لیے واحد کی ضمیر لائی گئی ہے۔ لہٰذا خدا کی اطاعت کی عملی شکل اس مملکت کی اطاعت قرار دی گئی۔ اب اس سلسلہ میں وہ آیات ملاحظہ فرمائیں جہاں اللہ و رسول کے لیے بطور مرکز مملکت کے واحد کی ضمیر لائی گئی ہے۔

1۔ اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْھُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ (3/172)، ترجمہ: جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا باوجودیکہ وہ زخم کھا چکے تھے ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں یقیناً ان کے لیے بہت اجر ہے۔

2۔ یہودیوں نے مدینے میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے حضورؐ سے کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو ''خدا اور رسول'' کی مخالفت کہا گیا ہے اس لیے کہ یہ اسلامی نظام کی مخالفت تھی ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ شَآقُّوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۚ وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (59/4) ترجمہ: یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ''اللہ اور اس کے رسول'' کی مخالفت کی ہے۔ جو کوئی اللہ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ کا قانون سخت سزا دینے والا ہے۔

3۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا مُّھِیْنًا (33/57)، ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں ذلت آمیز عذاب ہے اور خدا کی لعنت۔'' اس آیت میں اگر اللہ سے مراد اس کی ذات عالی اور رسول سے مراد ذاتِ رسالت مآب لی جائے تو اس کا کوئی مفہوم بنتا ہی نہیں۔ کیونکہ اللہ کو کس طرح اذیت دی جاسکتی ہے، اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ و رسول کو ایذا پہچانے کا مقصد نظام خداوندی کو نقصان پہچانا ہے۔

4۔ بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ (9/1)، جن مشرکوں نے تم سے معاہدہ کیا تھا ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔

اس بارے میں کہ قرآن نے اللہ و رسول کے الفاظ بطور ایک اصطلاح کے اسلامی نظام کے مرکز کے لیے استعمال کیے ہیں۔ اس بارے میں بہت آیات ہیں جن میں سے چند کے حوالے ہم تحریر کیے دیتے ہیں تاکہ یہ مضمون طویل نہ ہو۔ 24/63، 24/54، 80/20، 9/74، 9/62، 59/8، 33/36، 58/20، 58/5، 9/107، 8/13، 8/46،

9/24اس کے علاوہ اور بہت سے حوالہ جات ہیں۔

نکتہ یہ بیان کرنا ہے کہ یہ ایک اطاعت ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی اطاعت ہے۔ اس آیت میں دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اس آیت کی رُو سے اولی الامر کی اطاعت بھی فرض ہے۔ قرآن کریم نے اولی الامر کو حاملین عرش الٰہی بھی کہا ہے جب بھی دنیا میں اسلامی مملکت قائم ہوگی، تو جو لوگ اس حکومت کے قیام واستحکام کے ذمہ دار ہوں گے وہ ہی حاملین عرش الٰہی کہلائیں گے اور ان کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ ہمارے علماء کرام کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ اسلامی مملکت کے مقامی حاکم کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جب مقامی حکام کی اطاعت کو فرض قرار دے دیا تو اس کا ابتدائی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن نے انسانیت کو ایک نظام سے متعارف کرا دیا ہے۔ قرآن سے پہلے کسی جگہ بھی نظام کا تصور نہیں تھا۔ قبائلی نظام، یا قوت کے زور پر جاری کردہ کوئی بھی نظام ہو، اس میں انفرادی اطاعت ہوتی تھی۔ کسی کے ذہن میں بھی ایسا اجتماعی نظام کا تصور نہیں تھا جس میں کسی فرد کی اطاعت نہ ہو۔ قرآن کریم نے ایک نظام دیا اور اس نظام کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیا۔ اللہ کی عبادت کا عملی مفہوم اسلامی نظام کی اطاعت ہے۔ اصل نقطہ مَاسکہ اس مبحث کا یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت صرف اسلامی نظام کی معرفت ہو سکتی ہے اگر وہ نظام قائم ہے تو اللہ و رسول کی اطاعت ہو رہی ہے۔ لیکن اگر وہ نظام قائم نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کسی جگہ اسلامی نظام جاری نہیں ہے تو اس وقت اس وسیع وعریض زمین پر ایک گز جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں عبادت و اطاعتِ خداوندی ہو رہی ہو۔ ہم مسلمان صرف پرستش کر رہے ہیں ہم اطاعت نہیں کر رہے قرآن کریم نے عبادت کا لفظ محکومیت کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم نے جہاں قصاص کا حکم دیا ہے۔ وہاں فرمایا،

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ (2/178)، اے ایمان والو فرض ہوا تم پر (قصاص) برابری کرنا مقتولوں میں، آزاد کے بدلے آزاد، اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت (ترجمہ حضرت شیخ الہند)۔ اس آیت میں العبد کو الحر کے مقابلے میں لایا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ایک عبد اپنے آقا کی محکومیت و اطاعت کرتا ہے وہ اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا۔ سورہ یوسف میں ارشاد ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12/40) ترجمہ: حکومت اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو، اس آیت کریمہ میں حکومت اور عبادت کے الفاظ مترادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی داستان میں ہے کہ انہوں نے فرعون سے فرمایا کہ تم جو بنی اسرائیل پر اپنے احسانات بیان کر رہے ہو تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (26/22) ترجمہ: کہ تو نے تو بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے۔ اسی طرح قوم فرعون کا یہ فقرہ بھی قرآن نے نقل کیا ہے جبکہ انہوں نے کہا کہ ہم ان دونوں کی بات تسلیم کر لیں جو ہمارے جیسے

انسان ہیں وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23/47)۔اس بات کی تائید ہیں کہ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں اور آیات بھی پیش کی جاسکتی ہیں جو ایک کثیر تعداد میں بیان کی گئی ہیں۔

مسلمان اپنے اس زوال اور ادبار سے جب ہی باہر آسکتے ہیں جب وہ پرستش کے تصور سے نکلیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اختیار کریں اور پرستش اور اطاعت کے فرق کو سامنے رکھیں اور اس بات کو خوب ذہن نشین کرلیں کہ پرستش کا اطاعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پرستش کے نتائج ان کے نزدیک مرنے کے بعد آخرت میں ملیں گے جو ثواب کہلائے جاتے ہیں جبکہ اطاعت کے نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں اور اپنے ثمرات دینے لگتے ہیں۔ سورہ النور میں ارشاد عالی ہے وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (24/53)
ترجمہ: اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں اپنی تاکید کی قسمیں کہ اگر تو حکم کرے تو سب کچھ چھوڑ کر نکل جائیں، تو کہہ، قسمیں نہ کھاؤ، حکم برداری چاہئے جو دستور ہے اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو (ترجمہ حضرت شیخ الہند) اس آیت میں طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ کے الفاظ آئے ہیں جس سے یہ مراد ہے کہ اطاعت جانی پہچانی ہوتی ہے اور یہ بات ہر شخص محسوس کرسکتا ہے کہ اطاعت سرانجام دی جارہی ہے یا نہیں۔ اطاعت قسموں سے ثابت نہیں ہوتی عمل محسوس اپنا تعارف خود کراتا ہے۔

پرستش اور اطاعت میں دوسرا فرق یہ ہوتا ہے کہ پرستش صرف چند رسوم کے ادا کردینے سے ہوجاتی ہے۔ جبکہ اطاعت کرنے کے لیے ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (24/51) ترجمہ: ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب بلائیے ان کو اللہ و رسول کی طرف، ان میں فیصلہ کرنے کو، تو کہیں ہم نے سن لیا، اور حکم مان لیا اور وہ لوگ کہ ان ہی کا بھلا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں سماعت کو اطاعت کی شرط قرار دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سماعت کسی زندہ اتھارٹی کی ہوگی۔

اطاعت کرنے کی بجائے پرستش کرنے کے غلط عقیدہ نے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔ مذہب میں پرستش کے لیے الگ پرستش گاہیں مساجد ہوتی ہیں۔ لیکن دین میں وہ تمام ادارے جہاں سے قوانین خداوندی جاری ہوتے ہیں وہ مساجد ہوتے ہیں۔ سپریم کورٹ، پارلیمنٹ، تحصیل، تھانے یہ سب مساجد اللہ ہوتے ہیں۔ دین میں شرعی عدالتیں الگ نہیں ہوتیں، اس میں سب عدالتیں دینی ہوتی ہیں۔ قرآن کریم کے ہر حکم کی اطاعت، عبادت خداوندی ہوتی ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہوتی ہے جب آپ ٹریفک سگنل پر رکتے ہیں تو یہ عبادت الٰہی ہوتی ہے اس نظام میں تزکیہ نفس خود بخود ہوتا جاتا ہے، اور صبح سے رات تک تعلق باللہ قائم رہتا ہے۔ اس مملکت کی محسوس علامات Symbols شعائر اللہ کہلاتی ہیں۔ ان علامات کے احترام سے مملکت کا احترام ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کا

جھنڈا (Flag) کرنسی، پاسپورٹ سب شعائر اللہ ہوتے ہیں۔ ان شعائر کا احترام درحقیقت ان قوانین خداوندی کا احترام ہوتا ہے جن کے نفاذ سے وہ مملکت قائم ہوتی ہے۔ ان شعائر اللہ کی پرستش نہیں کی جاتی۔ ان کی ذاتی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محض علامات ہوتے ہیں ایک واجب الاحترام شے کی، قرآن کریم میں شعائر اللہ کی اصطلاح انہی معانی میں استعمال ہوتی ہے۔ ان شعائر اللہ کا احترام بھی ضروری ہے (22/32) اس کے برعکس طاغوتی نظام کے ہر حکم کی اطاعت معصیتِ خداوندی ہوتی ہے اس وجہ سے غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا قرآن کی رُو سے جرم ہے (6/123)

اللہ کی اطاعت تو ہوتی ہی اس نظام کے ذریعے ہے۔ جب حضورؐ نے بیاسی دفاعی لڑائیاں کر کے نظام قائم فرمایا تو حضورؐ نے اپنے فرائض سے تجاوز نہیں کیا۔ نظام کا قائم کرنا حضورؐ پر فرض تھا (42/13) اقامت دین ہی حضورؐ کی سب سے بڑی سنت اور اتباعِ اسوۂ حسنہ ہے۔ اس نظام کو سب سے پہلے حضورؐ نے قائم فرمایا حضور ﷺ خود اس نظام کی فائنل اتھارٹی تھے۔ حضورؐ کے بعد آپ کے جانشین اس نظام کی فائنل اتھارٹی تھے۔ اس لیے ان کی اطاعت عبادت خداوندی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا اور رسول کی اطاعت کے لیے اس بات کی نشاندہی کر دی۔ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8/20) اس حال میں کہ تم سن رہے ہو۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ اطاعت ایک زندہ محسوس اتھارٹی کے ذریعے ہوتی ہے کتب روایات کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔

جناب محترم یوسفی صاحب نے تحریر فرمایا "یہی وہ تزکیہ، یہ عقیدے، عمل اور اخلاق کو ہر آلائش سے پاک کرنے کا عمل" یہ تزکیہ مذہبی ہوتا ہے اور یہ غیر قرآنی تصور اور غیر قرآنی عمل ہے۔ قرآن کی رو سے تزکیہ نفس، انسانی ذات کی صلاحیتوں کو نشوونما دینا ہے۔ رسول اللہ کے فرائض میں لوگوں کا تزکیہ نفس کرنا بھی تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ نے وہ نظام قائم فرمایا تھا کہ جس میں ہر شخص کی ذاتی صلاحیتیں پوری پوری پروان چڑھ جاتی تھیں۔ جس میں جو Potential تھا وہ Actualize ہوتا تھا۔ انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ معاشرہ خود مستقل اقدار اور صفات خداوندی پر متشکل ہوتا ہے۔ اس قرآنی معاشرہ میں تزکیہ نفس از خود ہوتا چلا جاتا ہے۔ خود تزکیہ نفس میں اضافہ کرتا چلتا ہے۔ جس رزق کی تقسیم قانون خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی اس رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے۔ غیر اسلامی نظام کی معیشت کا انحصار ربوٰ پر ہوتا ہے جو اللہ رسول کے خلاف جنگ ہے۔ اس رزق کے کھانے کے بعد تزکیہ نفس کبھی نہیں ہو سکتا ہے جو حرام رزق کھاتا ہے اور اللہ سے جنگ کرتا ہے اس کا تزکیہ نفس نہیں ہو سکتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (53/32) تم خود یہ خیال نہ کرو کہ تمہارا تزکیہ نفس ہو رہا ہے اس کو جانچنے اور ماننے کا معیار اور پیمانہ صرف خدا کی کتاب ہے نہ کہ انسانوں کے خود ساختہ پیمانے (91/7، 92/17) قرآن کریم نے تزکیہ نفس کا اصول خود بتا دیا فرمایا اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92/18) جو اپنا مال نوع انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھتا ہے اس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ اس کی مزید تاکید فرمائی مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (92/5) جو دیتا ہے وہ تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ سورہ النساء میں ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ (4/49) ذرا ان لوگوں کی حالت بھی

دیکھو جو اپنے تزکیہ نفس کے مدعی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی نفوس کا تزکیہ کرلیا ہے بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ (4/49)، یاد رکھو انسانی ذات کا تزکیہ خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ صرف اس نظام میں ہوسکتا ہے جو مستقل اقدار پر قائم ہوتا ہے اور ہر فردِ انسانی کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا چلتا ہے۔

آخر میں جناب یوسفی صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ ان کے احترام کے پیش نظر ہم نے ان کے مضمون پر تبصرہ نہیں کیا ہے صرف تحریک طلوعِ اسلام کا مؤقف بیان کیا ہے۔ جو شخص بھی قرآن کریم کا طالب علم ہے۔ ہم اس کا احترام کرتے ہیں۔ سوچ میں اختلاف کی وجہ سے کسی قرآنی طالب علم کا احترام ہمارے دل میں کم نہیں ہوسکتا البتہ یوسفی صاحب سے اتنی درخواست ضروری ہے کہ اس دور میں پوری انسانیت اور خاص طور پر مسلمان بڑے مصائب کا شکار ہیں۔ ساری انسانیت کے مصائب کا حل صرف نظام خداوندی کے قائم کرنے میں مضمر ہے۔ قرآن کریم انسانیت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور یہی اس کی وحی الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ اس وقت خاص طور پر جب انسانیت اپنے وضع کردہ تمام نظام ہائے باطل سے تنگ اور مایوس ہوچکی ہے۔ آپ مسلم اور غیر مسلم مفکرین کے سامنے اسلام کا نظام پیش کریں۔ امریکہ، یورپ اور دیگر ممالک جن اقدار پر عمل کررہے ہیں وہ سب باطل اقدار ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم کی عطا کردہ اقدار حق ہیں، اور وہ صرف اس وقت اپنے نتائج دیتی ہیں جب آپ ان کی بنیاد پر ایک معاشرہ کی تشکیل کریں۔ اسلامی نظام میں صفات خداوندی ٹھوس، محسوس شکل میں سامنے آجاتی ہیں۔ اس نظام کے قیام سے غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ (3/139، 4/141، 9/33، 48/28، 61/9) اس نظام کی معرفت دعائیں پوری ہوتی ہیں (27/62) اور صرف اسی نظام کے ذریعے تزکیۂ نفس اور عبادت خداوندی ہوتی ہے۔

ضرورتِ رشتہ

ایک بیٹی، عمر 28 سال، میڈیکل ڈاکٹر (MD)

یورپ کی شہری اور یورپ کے گورنمنٹ ہسپتال میں ڈاکٹر۔ پنجاب کے معروف اور تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق مختصر افرادِ خانہ پر مشتمل کنبہ کے لئے رشتہ درکار ہے۔

نوجوان کی عمر 28 سے 30 سال تک ہو، میڈیکل ڈاکٹر، فارماسسٹ یا اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیشنل ڈگری ہولڈر جو یورپ میں Set ہوسکے۔ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔

رابطہ بذریعہ والدین رابطہ کے لئے ای میل wishbest786@gmail com

ڈاکٹر انعام الحق۔ اسلام آباد

باب المراسلات

پرویز صاحب کی سوچ کی پیروی کرنے والوں کی ذہنیت پر اعتراض

ایک صاحب نے فیس بک پر درجِ ذیل تحریر پیش کر کے کمنٹس مانگے کہ:

لاشعوری طور پر اندھی تقلید:

''حالانکہ علامہ پرویز صاحب کا میں دِل سے بہت احترام کرتا ہوں۔ پھر بھی مجھے یہ تحریر لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

مَیں بہت عرصے سے ایک بات کا مشاہدہ کر رہا ہوں، کہ اکثریت یہ کہتی ہے کہ ہم کسی بھی شخص سے عقیدت کی وجہ سے قرآن کی تعلیم کو نہیں مانتے بلکہ اس کی دلیل کی بنیاد پر مانتے ہیں، لیکن اکثر قرآنسٹ خاص طور پر علامہ پرویز کے منع کرنے کے باوجود ان کے ہی مفہوم وتشریح کو حرفِ آخر مان کر انہی کی باتوں کو آگے چلا رہے ہیں، اور خود بالکل غور فکر نہیں کرتے اور اگر کوئی محترم علامہ پرویز صاحب کی کسی بات کو دلیل کی بنیاد پر رد کر دے تو وہ دلائل سمجھنے اور اپنی اصلاح کرنے کی بجائے، اس بات پر اڑ جاتے ہیں کہ نہیں جی صرف علامہ محترم پرویز صاحب کا موقف ہی صحیح ہے باقی سب قرآن کا مفہوم غلط لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح قرآن کا مفہوم اور تشریح دیگر قرآنسٹ عالموں کے پیروکار کر رہے ہیں، جس کو ایک دفعہ آئیڈیل مان لیا، بس اس کی ہر صحیح یا غلط بات کا دفاع کرتے رہتے ہیں، یعنی اُنہوں نے لاشعوری طور پر اپنے اندر فرقہ بندی پیدا کر لی ہے۔ ماجد احمد خان''

اِس تحریر کے جواب میں، مَیں نے یوں وضاحت پیش کی کہ:

''آپ کی بغیر فُل سٹاپ یعنی بغیر سانس لئے تحریر پڑھ کر متاثر ہوا۔ اگر آپ جیسے اصحاب کی مُثبت سوچ لئے ہوئے اصلاح کی خواہشمند تنقید کسی ادارہ کو ملتی رہے تو اُس کے لئے منفعت کا سامان ہی مہیا کرتی ہے۔

مَیں آپ سے سو فیصد مُتفق ہوں کہ پرویز صاحب کی سوچ سے آگے ضرور بڑھنا چاہیئے، لیکن یہ اُنہی حضرات کے لئے ممکن ہوگا جو پہلے اُن کی سوچ تک پہنچ چکے ہوں۔ لہٰذا ہمارا پہلا ہدف تو پرویز صاحب کے موقف تک کی آگاہی ہوگا، تاکہ ہم یہ ہدف عبور کر سکیں۔

مَیں تو پچھلے بیس سال سے دن رات اُن کے قرآن کو الحق ثابت کرنے کے دلائل کی سوچ کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش میں لگا ہوں اور اپنی دوسری ہر قسم کی مصروفیات سے الگ ہو کر اپنی تمام توانائی اس ثبوت کی رسائی میں صرف کر رہا ہوں۔ اسی کے حصول کے دوران میں نے فلسفہ، عربی اور قانون کی تعلیم کے لئے باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی اور اسلامک سٹڈی میں ماسٹر،

ایم فِل اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اس کے علاوہ دو کتابوں کی تصنیف کرتے ہوئے درجنوں مقالہ جات بھی شائع کروائے۔ اِن کے باوجود بھی جب کبھی بھی قرآن کے موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے تو اِس کے لئے محترم پرویز صاحب کی تصانیف کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیتا ہوں اور اُسے بار بار جاننے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ اُس کا مطالعہ کرتا ہوں تو اپنے علم کی موجود رسائی سے بہت آگے پاتا ہوں اور نئے زاویہ سے روشناس ہو کر اپنی فہم میں اضافہ کرتا رہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ بھی محترم پہلے اس مشق سے نبرد آزما ہو کر اپنے علم تک کی رسائی کی قابلیت کا تجربہ ضرور کریں اور اگر کمی محسوس کریں تو اپنی قابلیت کے معیار کو محترم پرویز صاحب کے بار بار مطالعہ سے اُن کے دلائل سے پوری طرح آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اگر کامیابی میں ابھی مزید وقت کی ضرورت محسوس کریں تو تردد کی ضرورت نہیں، کیونکہ اُن کی تحقیق مزید کئی نسلوں کی تحقیقی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اگر آپ علامہ پرویز صاحب کے دلائل کی پوری طرح واقفیت حاصل کر چکے ہوں اور اُن کے دلائل کے معیار سے اپنے آپ کو بلند محسوس کریں تو آپ کے علم تک رسائی پانے کی ہم لوگ بھی کوشش کرنے سے پیچھے نہیں رہیں گے، جس طرح ہم علامہ پرویز کے دلائل سے مستفید ہو رہے ہیں۔''

جواب: میرے اس خط کا فوری جواب موصول ہوا کہ:

محترم انکل پیشگی معذرت کے ساتھ میں آپکی رائے سے متفق نہیں ہوں، آپکے خیال میں پہلے علامہ پرویز صاحب کی سوچ تک پہنچنا کیوں ضروری ہے؟ جبکہ اصل کتاب قرآن آپ کے پاس موجود ہے جس کی تعلیم تک پہنچنا اصل ضرورت ہے، باقی جتنے بھی عالم ہیں ان کی رائے سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، اب آپ کے کمنٹ سے ہی یہ بات ظاہر ہو گئی آپ کیونکہ پرویز صاحب کو حرف آخر مانتے ہیں اس لیے جب بھی کسی الجھن کا شکار ہوتے ہیں تو علامہ پرویز صاحب کی رائے سے خود کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ علامہ جتنی سوچ کسی کی نہیں سو علامہ پرویز صاحب کی ہی بات حرف آخر مان لی۔

مُعترض نے مزید یہ بھی فرمایا کہ:

محترم انکل آپ نے بہت خوبصورت انداز میں وضاحت کی۔۔ مگر میرا اختلاف قرآن کے سمجھنے کے طریقے سے یا محترم علامہ پرویز صاحب سے نہیں ہے، میرا موقف یہ ہے کہ کیونکہ علامہ بھی ایک انسان تھے تو مختلف جگہوں پر الفاظ کے مفہوم کا چناؤ کرتے وقت ان سے بھی درست چناؤ نہ ہو سکا ہو۔

اِن سوالات کو مَیں نے ایک مُثبت سوچ کا نتیجہ سمجھتے ہوئے تفصیل سے جواب دیا کہ:

ماجد صاحب، آپ نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ قرآن کا نسخہ اور علم رکھتے ہوئے ہمیں کسی شخصیت کی سند کی ضرورت نہیں رہتی۔

شخصیت پرستی کی ممانعت:

یہی بات قرآن میں بھی ہے کہ:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل 17:36)

کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً تمہاری سماعت و بصارت اور دل (Mind) یعنی انسان کے اپنے ہی ذرائع علم، سب ہی کی باز پُرس ہونی ہے۔

قرآن نے اس کے علاوہ بڑے واضح انداز میں اُمت کی آرا کو انسان پر مسلط کرنے سے روکا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (البقرہ 2:134)

یہ امت تو گزر چکی ہے جو انہوں نے کیا تھا وہ اُن کے لیے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لیے ہے اور اُس کے متعلق تم سے باز پرس نہ کی جائے گی جو وہ کرتے تھے۔

شروع ہی میں وضاحت کرنا چاہوں کہ یہاں مسئلہ محترم پرویز صاحب کی شخصیت اور سوچ کا نہیں بلکہ مَیں تو اسے خود قرآن اور اُس کی فہم کا لیتا ہوں۔ محترم پرویز صاحب کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ ہی یہی رہا ہے کہ وہ شخصیت کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ہی اپنی کہی ہوئی باتوں کو حرفِ آخر سمجھتے تھے۔ لہٰذا اُن کی سوچ سے مُتفق اصحاب سے بھی ایسی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

محترم پرویز صاحب کا اُن کی شخصیت کے تناظر میں تجزیہ کرنا ناانصافی ہوگی اور اُن کی سوچ کا اندازہ اور فیصلہ اُن کی زندگی بھر کے اسی تصور کے ثبوت فراہم کرنے سے لگایا جانا چاہیے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور مُطلق الحق ہے۔ اِس میں کسی قسم کے اختلافات نہیں پائے جاتے، اس لئے بھی کہ الحق ایک ناقابلِ تقسیم وحدت و توحید ہے، جس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے بھی کہ اختلاف ہونے کی صورت میں حق، حق نہیں رہتا بلکہ باطل کی آمیزش سے آلودہ ہوجاتا ہے۔

لہٰذا علامہ پرویز صاحب کے مقام کا تعین ہم اُن کے دلائل سے کرتے ہیں جو اُنہوں نے قرآن کو الحق کے ثبوت دے کر اپنا فریضہ ادا کیا ہے۔ اِس ضمن میں اپنی تعلیمی کاوشوں کو آپ کے سامنے لاتے ہوئے یہ رائے وصول کرتے ہوئے تشنگی محسوس ہوئی کہ ہمارا مطالعہ صرف اور صرف علامہ پرویز کی سوچ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے آپ اگر اپنے اعتراض میں ذاتی تجربہ اور سوچ سے آگاہ کر دیتے تو اُس کی روشنی میں بھی ہم اپنی مقدور بھر کوشش کرنے کے قابل ہوجاتے۔ ہماری معذوری یہی ہے کہ ہمیں کہیں سے پوری کاوشوں کے باوجود بھی سوچ میں مزید ارتقاء کے لئے وہ راہنمائی دستیاب نہیں ہوئی جو ہمیں علامہ پرویز کی طرف سے حاصل ہو رہی ہے۔ لہٰذا مَیں آپ کے سوال کا تفصیلی جواب علامہ پرویز کی شخصیت سے قطع نظر کرتے ہوئے قرآن کے اختلافات و تضادات سے پاک الحق ہونے کے ثبوت میں دے رہا ہوں۔ میری نظر میں علامہ پرویز کے مقام کا اُن کی شخصیت کے حوالہ سے نہیں بلکہ قرآن کے الحق کے ثبوت میں دئے گئے دلائل کے ابلاغ کی کاوشوں کے اعتراف سے متعین ہوتا ہے۔

قرآن میں اختلافات اور تضادات ہونے کے اعتراض کا تجزیہ:

چونکہ گروہ بندانہ مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو، یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) کہ قوم کے سامنے، اس کے نظریہ حیات اور نصب العین زندگی کے متعلق کوئی متفق علیہ اور متعین مفہوم نہ آنے پائے، اس لئے یہ اعتراض وارد کر دیا جاتا ہے کہ قرآن بے شک ایک متعین کتاب کا نام ہے، لیکن اس کتاب کا مفہوم تو متعین نہیں، اس کی تعبیر تفسیری روایات کی مدد سے الگ الگ کی جاتی ہے۔

قرآن کے مفہوم و تعبیر میں اختلاف کا تجزیہ:

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ (انسانی تصانیف میں بھی) ایک عمدہ کتاب کی بنیادی خوبی یہ قرار دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح اور متعین طور پر سامنے لائے۔ اگر کوئی تحریر ایسے الفاظ میں منضبط ہو کہ وہ ہر شخص کو اس کی منشاء کے مطابق (الگ الگ) معانی دے، تو وہ کتاب اعتناء کے قابل نہیں سمجھی جائے گی۔ جب انسانی تصانیف کے عمدہ ہونے کا معیار یہ ہے، تو ایک ایسی کتاب، جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ کسی انسان کی نہیں، بلکہ انسانوں سے بلند و بالا، خود خدا کی تصنیف ہے، تو کیا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس کے الفاظ مختلف اور متضاد معانی دینے کے حامل ہوں؟

قرآن کے نظریات میں اختلاف نہ ہونے کا مفہوم۔ یہاں اختلافات سے پاک ہونا وضاحت طلب امر ہے۔ قرآن کے دعویٰ کے مطابق اختلافات کی گنجائش نہیں البتہ اِس سے اخذ کردہ نتائج اور دلائل و براہین تو انسانی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اِس میں اختلافات سے پاک ہونے کا دعویٰ فقط ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ علمی اور عقلی طور پر صحیح ہو۔ کسی تصور کا علمی اور عقلی طور پر درست ہونا، اِس کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ وہ اِن تمام تصورات کے ساتھ مناسبت و مطابقت رکھتا ہے، جو عقلی و عملی طور پر درست مانے جا سکتے ہیں۔

صحیح تصورات کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ عقلی اور علمی نقطہ نظر سے ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں لہٰذا وہ تصورات کا ایک ایسا مجموعہ بناتے ہیں، جس کے اندر غلط تصور داخل نہیں ہو سکتا۔ فلسفہ کی دنیا میں بھی ایسا نظریہ جس کے تمام تصورات ایک ہی مرکزی نظریہ سے ماخوذ ہوں، اُس میں حقیقی تضادات کا ہونا ناممکن ہے۔ ایسی حالت میں تضاد پڑھنے والے کے ذہن میں تو ہو سکتا ہے، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے وضاحت کی ہے، فلسفی کے ذہن میں نہیں ہو سکتا۔

ہم اِس مجموعہ سے کوئی تصور نکال کر اِس کی جگہ کسی غلط تصور کو نہیں رکھ سکتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو وہ تصور اِس مجموعہ سے غیر متعلق اور الگ تھلگ نظر آئے گا، اور اِس کی وجہ سے مجموعہ کے منطقی تسلسل میں ربط نہ رہنے کی وجہ سے حقیقت سے دور چلا جائے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن سے اختلاف کرتے بھی ہیں، اُنہیں علم کی سند حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ ضد میں آ کر ہی اختلاف کرتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب کی شخصیت اور سوچ قرآن کے اختلافات سے پاک اسی الحق کے تصور سے وابستہ ہے اور اُن کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار بھی یہی تصور ہے۔

آپ اپنے اعتراض میں اِس کی بھی تصدیق چاہتے ہیں کہ:

جن لفظوں کے معنی محترم علامہ پرویز صاحب نے لیے کیا وہ واقعی ہی قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہیں۔

میں آپ سے اس بات میں مُتفق ہوں کہ محترم پرویز صاحب نے عام روش سے ہٹ کر فہم القرآن کے اصول دئے ہیں جن کی وجہ سے اُنہیں بڑی تُند و تیز تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُنہوں نے البتہ درجِ ذیل اصولوں کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی اور نہ ہی اُن پر اس ضمن میں تنقید سامنے آئی ہے۔

فہم القرآن کے اصول:

1۔ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ لہٰذا اُسے اُس کی زبان یعنی نزولِ قرآن کے دور میں بولی جانے والی دورِ جاہلیت کی زبان سے سمجھنا ہوگا۔

2۔ قرآن خود اپنے کلام کی، تصریف آیات کی مدد سے، تفسیر کرتا ہے اور اپنی اصطلاحات کی خود وضاحت کر دیتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس اصول کو اپنانا ہوگا۔

3۔ قرآن کے مخاطب فرد کا تعلق کسی خاص دور کے فرد سے نہیں بلکہ قیامت تک کے ہر فرد اور دور سے ہے۔

قرآن کو سمجھنے کے لئے ہر دور کے فرد کو اپنے دور کی علمی تحقیق کی روشنی میں اپنی عقل و فکر سے سمجھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اسے آج کے دور میں علمی روش سے تعبیر کیا جاتا ہے اور علامہ اقبال نے اسلاف کی تقلید کے مقابل اس علمی روش کو اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔

تفسیری روایات کی مدد سے قرآن کے الفاظ کے مفہوم:

ہمارے ہاں قرآن کا ایک خاص مفہوم متعین ہو چکا ہے، اور عرب ہوں، یا غیر عرب، ہر جگہ وہی متعین مفہوم رائج ہے۔ قرآن کے الفاظ تو بے شک وہی ہیں، لیکن ان الفاظ کا مفہوم، عجمی تصورات پر مبنی ہوتا ہے۔ جب قرآن نازل ہوا، تو ان اصطلاحات میں سے کسی کا وجود نہیں تھا، جو بعد میں فقہ، روایات، تصوف اور کلام وغیرہ کی رو سے پیدا ہوئیں، اور آہستہ آہستہ، دین کا جزو بنتی چلی گئیں۔ لہٰذا، عجمی تصورات کے تحت جو کچھ سمجھا جاتا ہے، وہ درحقیقت قرآن کا مفہوم نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر قرآنی مفہوم ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ عجمی مفہوم کو صَرفِ نظر کر کے دیکھا جائے کہ محاورہء عرب میں اس کا کیا مفہوم لیا جاتا تھا، پھر دیکھا جائے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ کہاں کہاں استعمال ہوا ہے، ان سب مقامات کو جمع کر لیا جائے تو تصریف آیات کی رو سے کسی خاص مقام پہ کسی خاص لفظ کا صحیح قرآنی مفہوم ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

علامہ پرویز کے موقف پر تنقید کے لئے علمی روش:

پرویز صاحب نے اپنی تالیف ''لغات القرآن'' میں قرآن کے الفاظ کا ترجمہ اپنی طرف سے نہیں کیا اور نہ آج کے دور میں کوئی شخصیت ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اُنہوں نے مستند ترین لغات کی مدد اور باقاعدہ حوالے دے کر لغات القرآن کی ترتیب و مدون کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اب اگر علمی اور منطقی اصولوں پر اُن پر تنقید بنتی ہے تو صرف اس نشاندہی سے کہ:

1۔ کیا مستند لغات سے مدد لی گئی ہے اور اُن کے صحیح حوالے دئے گئے ہیں۔

2۔ کیا مستند حوالوں میں عربی زبان کے قوائد و ضوابط کی پابندی کی خلاف ورزی سرزد ہوئی ہے۔

3۔ وہ خود دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنہوں نے جو الفاظ سے مفہوم لیا ہے، وہی مفہوم قرآن میں بیان کئے گئے انہی الفاظ کا دیگر عُلماء نے بیان کیا ہے۔ کیا اُن کا دعویٰ باطل ہے اور وہ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

عصرِ حاضر میں جبکہ اپنی طرف اور سند سے کسی دوسری زبان کا ترجمہ کیا ہی نہیں جا سکتا کسی بھی شخصیت پر اپنی طرف سے غلط ترجمہ کا الزام لگانا بلا جواز ہوگا۔

مجھے اُمید ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد آپ کو سوالات کے جواب مِل گئے ہوں گے۔ مَیں محترم پرویز صاحب کی سوچ سے آگے نہ بڑھنے کی توجیہہ اس لئے کر رہا تھا کہ کسی بھی ہدف سے آگے بڑھنے کے لئے پہلے اُس ہدف تک پہنچنا لازمی ہوتا ہے۔ جیسے کالج میں داخلہ لینے کی صلاحیت حاصل کرنے کیلئے پہلے میٹرک تک کی تعلیم پوری کرنی ہوتی ہے۔

غیر منطقی جذباتی اعتراضات:

بعض اوقات ہم اعتراضات کرتے وقت جذباتی بھی ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ یونیورسٹی کے ایک سینئر پروفیسر نے مجھے بڑے فخر سے جتلایا کہ اُن کے والد محترم نے علامہ پرویز صاحب کو بھری مجلس میں چیلنج دیا تھا کہ وہ بغیر اعراب کے قرآن کی تلاوت کرنے کا اُن سے مقابلہ کریں۔ اگر وہ بغیر اعراب کے پڑھنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ مان جائیں گے کہ اُن کو یعنی محترم پرویز صاحب کو عربی زبان آتی ہے۔ میں نے عرض کی کہ وہ مجھے اس چیلنج کا جو جواب محترم پرویز صاحب نے دیا ہوگا وہ آپ نہ بتائیں بلکہ میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ وہ اسے سُن کر ضرور مسکرا کر چلے گئے ہوں گے۔ اُنہوں نے مجھ سے وضاحت چاہی کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بھاگ گئے تھے۔ مَیں نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ قرآن سے ہدایات لیتے تھے اور اسی لئے اُس محفل سے کنارہ کشی کر لی جہاں غیر منطقی لغو معیار کی بات ہو رہی ہو۔

پھر میں نے اُن کے سامنے محترم پرویز صاحب کی مرتب کی ہوئی لغات القرآن کی کاپی رکھ دی کہ اس میں کسی ٹائپ کی غلطی کو صرفِ نظر کرتے ہوئے کسی قسم کی مستند سند کا حوالہ کے بغیر اور یا پھر اُس میں سند سے مختلف مواد ہونے پر اُن کی طرف

سے تحریف کرنے کی غلطی کی نشاندہی کر دیں۔ اگر اِس کا تسلی بخش جواب نہ دستیاب کیا جا سکے تو میں اُن کی عربی زبان میں مہارت نہ ہونے کا سوچ سکتا ہوں۔

اپنے اِن معصوم اور مہربان پروفیسر صاحب کا نام تو میں اب اِس عُمر میں بھول گیا ہوں، لیکن اتنا یاد ہے کہ اُن کا اور اُن کے دونوں بھائیوں اور والد کا نام میاں سے شروع ہوتا تھا اور آخر میں صدیقی کی چھوٹی "ی" پر ختم ہوتا تھا۔ وہ سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تعلیمی درسگاہوں میں ممتاز مقام کے حامل تھے، لیکن مجھے اُن کی طرف سے تحریف کی نشاندہی موصول ہونے کا بیس سال سے ابھی تک انتظار ہے۔

محترم، آپ محترم پرویز صاحب کی سوچ پر تنقید ان اصولوں کی خلاف ورزی کی نشاندہی کی بِنا پر کر سکتے ہیں، اگر آپ ان کے اصولوں سے مُتفق ہیں جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ ویسے ہی عمومی قسم کے تصورات کو ہر ایک پر ٹھونسا جانا علمی روش نہیں بلکہ میرٹ پر لاگو کی جاتی ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ حق ناقابلِ تقسیم وحدت ہوتا ہے اور اگر اُس میں باطل کا شائبہ بھی شامل ہو جائے تو وہ سب کا سب باطل کہلائے گا۔ لہٰذا قرآن میں پورے کا پورا داخل ہوا جاتا ہے اور مصلحت Compromise کی گنجائش نہیں رکھی جاتی۔ Either you are with me or against me یہی ہماری مملکتِ پاکستان کا مومن اور کافر میں تقسیم ہونے کا دوقومی نظریہ ہے۔

ایک تائیدی بیان ایک بلوچ سینئر بیوروکریٹ کے قلم سے نکلا ہے اور ظاہر ہے کہ بلوچ اپنا ایک مخصوص لہجہ رکھتا ہے۔ اب ناراضی پر مبنی مزید وضاحتیں ہمارے اس بلوچی دوست سے مانگی جا رہی ہیں۔ بعض اوقات کُچھ احباب فیس بک پر آ کر جان بوجھ کر غیر منطقی بحث میں اُلجھانے اور اُس پر بیجا اصرار کر کے تنگ کرنے کا ایجنڈا لے کر آپ سے فضول باتوں پر بحث شروع کر دیتے ہیں اور شریفانہ انداز سے اُسے ختم ہونے نہیں دیتے۔ ایسے میں ہمارے یہ بلوچ دوست رحمت کا فرشتہ بن کر مدد کو آتے ہوئے اپنے تحکمانہ لہجے سے ان کو کھری کھری سُنا کر بھگا دیتے ہیں۔

مجھے ایک صاحب کی طرف سے شکایت موصول ہوئی کہ:

اعتراض:۔ کچھ نقل کرنے کے بعد پرویز صاحب کا نام دینا چاہے تھا، کسی کی تحریر کو اپنے نام سے منسوب کرنا ادبی سرقہ ہے۔

جواب: شروع ہی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ سلسلہ علامہ پرویز کے دروس سے انتخاب کیا گیا ہے۔ انتخاب کیا ہوا مواد میری ذمہ داری ہے اور میں اس کے لئے جوابدہ بھی ہوں۔ لہٰذا اس پر اعتراض کا جواب دینا اور مزید وضاحت کرنے کا فریضہ نبھا رہا ہوں۔ اس میں ادارہ کی رضامندی بھی ہے اور میں اُس کے نمائندے کا فریضہ بھی ادا کر رہا ہوں۔ سر اگر تسلی نہ ہوئی ہو تو آپ مزید ہدایات سے نوازیں تا کہ سرقہ کی سزا کے طور پر ہاتھ کٹوانے سے بچ سکوں اور قرآن کے ابلاغ کا سلسلہ بھی جاری رہ سکے۔

The Missing Link

Dr. Mansoor Alam

"It was during the ten years of 'Umar's caliphate that the most important conquests of the Arabs occurred," says Michael Hart in his book, *The 100*. "Caliph Umar's reign saw the largest expansion in the history of Islam. To sustain this expansion he embarked upon one of the most innovative administrative reforms the world had yet seen. Political, economic, and social reforms which he instituted, to run the affairs of the state, became the model for efficient public administration. In a very short time he transformed the primitive and essentially local administrative structure into the most modern and global one of its time. People enjoyed basic human rights and freedoms during his rule, essentially unheard of at the time. If an old woman could question and criticize Caliph Umar in public without fear of retribution, then there could be no doubt about the freedom of expression prevailing during his rule."

Encyclopedia Britannica (in its concise edition) notes that Caliph Umar's mandates, "a*ffected taxation, social welfare, and the empire's entire financial and administrative fabric" and that "he was noted for his justice, social ideals, and candor."*

Among `Umar's most significant developments (mentioned in *Abu Hilal al-`Askari's Kitab al-Awa'il* and *Tabari's history*) are:

- Establishment of *Bayt al-mâl* or The Department of the Treasury
- Establishment of the judicial branch of the government, i.e., courts of justice
- Establishment of the Hegira calendar
- Organization of War Department
- Putting army reserves on payroll
- Establishment of the Land Revenue Department
- Survey and assessment of lands
- Establishment of a Census Department
- Establishment of provinces and districts (within each province)
- Establishment of taxation and customs departments
- Organization of the Police Department
- Establishment of military barracks at strategic points

- Establishment of rest houses on the way from Mecca to Medina for the comfort of travelers
- Establishment of a welfare allowance for children.
- Provision for the care and bringing up of foundlings.
- Declaration of the end of slavery (whether Muslim or non-Muslim).
- Stipends for the poor among the Jews and the Christians.
- Establishment of a Department of Public Education.
- Development of a system of canals and dams.
- Development of new cities and roads.

To efficiently run the affairs of these various departments Caliph 'Umar established (what in modern times is known as) a government secretariat. Every government department had an office within this secretariat where separate registers were kept to deal with matters of the state. All official business of the state was documented in writing. Written memos were routinely issued by the Caliph to his government officials (including provincial governors). Treaties and agreements with other states were concluded and their texts kept on record within these offices.

But here is a point worthy of special note.

The Islamic state was established during the Prophet's time. This region expanded during the period of Caliph Abu Bakr and reached to about two and half million square miles during Caliph Umar's period. During this entire period (and even during Caliph Usman's period) Medina was the capital of the Islamic state. The aforementioned secretariat, including all of its offices was in Medina.

Is it not surprising then that not a single original written record of that time exists today?

Medina, according to the historic record, has remained free from natural disasters. Neither earthquake, nor large fire is known to have occurred in Medina and there is no record of any calamity that could account for the destruction of so significant a collection of data.

Never has Medina come under the control of a crusading army or been subjected to an event that could explain why the records are missing. From the era of Prophet Muhammad (PBUH) until the current day, Medina has remained under the continuous control of Muslims in a land well cared for and revered. Under these circumstances it is perplexing to figure how it came to be that no trace remains of such significant records. What has happened to all the

documents? Who took them? Were they destroyed and if so, why?

Historians who have presented recensions of some of the records of those times have not mentioned where they saw the originals or what happened to them. There is no trace of the original records in our history books.

Early historians such as Ibn Hisham (d. 833c) and Imam Tabari (d. 923c) attempted to discern the more credible aspects of legend but lacked authentic documentation for reference. Hadith collectors, such as Imam Bukhari (d. 870 C), strove endlessly, (according to their own accounts), in search of original material for their books. Diligent researchers traveled to far off places and met hundreds and thousands of people. If there were written records available anywhere, it is reasonable to expect they would have found them. It is evident then and necessary to note that there were no original records to be found at that time, thus the early historians endeavored to compile their books on the basis of oral narrations. [Given this situation, it seems strange that we find in our history books detailed dialog, verbatim, between two soldiers in a battlefield, neither of whom survived!]

The original written documents that once existed were a precious historical treasure deeply relevant to the precedents established within early Islamic history. These valuable records should have been preserved as a sacred trust for the Muslim ummah. They would have proved valuable as a guide and blue print for the establishment and management of a true Islamic state. They would also have served as a worthy deterrent to anyone who tried to change the basic nature of Islam.

The inexplicable loss of records integral to early Islamic governance leaves questions that must be considered. Were there Muslims within the community who wanted to change Islam's political and economic structure who may have felt that their desired alterations would not have been possible in the presence of documents that establish an Islamic precedent? Would Muslim kings have been able to rule abjectly in the name of Islam had records existed that established a set parameter? Was clemency in Islamic governance as established by Caliph Umar an inconvenient barrier to those who sought absolute power?

If a subsequent ruler or 'ulema aspired to subjugate the masses, for example, by imposing excessive ritual upon the people, the presence of documentation specifying the natural order of the community, would have prevented deviations from the Prophet's model. Without the original record, however, no evidence could be brought forward to bar whatever abuse or innovation a leader wished to impose upon the community. What led to this

precarious development and what disaster, intrigue or tragedy could explain this mystery?

These are all questions worthy of our consideration. Yet, surprisingly, we find little to no research into what essentially amounts to a 'missing link' in our history. Although there are orientalists who look to this mystery with some interest, Muslims seem willing to sit content with their retellings rather than wanting to rise to seek out all relevant records and historic references to early Islam or to establish a renewed social ethic by returning to the heart of the revelation itself. It is discouraging to see that the majority of our historians and legalists are more intent on recycling the oral accounts that supplanted our history rather than searching to discover the authentic remnants meant to serve as our sacred trust.

Archeologists have found the Code of Hammurabi from the ruins of the ancient Babylon and Nineveh. They are busy discovering the ancient civilization of Egypt from the writings on the stones and walls in the tombs of the Pharaohs. Historians have even found the Dead Sea scrolls from the time before Christ. But, as noted before, not a single written document (related to the government of the Islamic state) has ever been found from the city of Medina when it served as the capital of Islam. [The few letters of Prophet Muhammad (PBUH) that have come to our attention have come to us from areas outside of Medina under the control of non-Muslims.]

As far as we can determine, no historian has ever made an investigation into the whereabouts of the original written documents from the period of Caliph Umar. Is this investigation not worthy of our attention? We should keep in mind that Caliph Umar's established parameters for running a government is generally recognized as a model for good governance even by non-Muslims. [Gandhi often cited Caliph Umar's period of rule as a model of good governance.] Imagine the difference it would make to us had the original documents been preserved. It would aid us in defining the Islamic way of governance, in helping us resolve our endless sectarian arguments, in deciding what is (or is not) according to Shariah and in removing controversies surrounding secular versus conservative forms of Islamic government.

In considering the many benefits of the original documents that Caliph Umar left in our care, what would we say were he able to ask us what happened to this well-formulated and thoughtfully documented system of governance established as a just Islamic State? What could we possibly say?

Surah *Al-Takwir* (التکویر) – *Durus-al-Qur'an Parah 30*: Chapter 11

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is July 27, 1984 and today's lecture starts with verse Surah *Al-Takwir* (التکویر). This is chapter 81 of Parah (part) 30 of the Holy Quran (81:1).

The importance of metaphorical meaning of Quranic words

As a way of introduction let me repeat once again what I mentioned at the beginning of Parahs (parts) 29 and 30: that in these parts especially the Quran presents descriptions of certain critical events, e.g., that moon will be split; that sun will disintegrate or will be eclipsed; or that darkness will take over the sun; or that stars will get scattered around; or that the sky will be rent asunder; or that mountains will crumble etc… In these two parts such words will often come. I had mentioned in the beginning itself that if we take the literal meaning of these words then it will mean that this physical Universe will end one day. This Universe is not eternal and it is bound to end one day anyway. So, these descriptions in the Quran could be taken literally that these events will occur in the physical Universe. But I do not give preference to this meaning. It is okay that this Universe will end one day. But the basic aim of the Quran is to guide humankind, to solve human problems. It is to establish a system that will lift mankind in terms of its humanity. This is the proclamation and the calling of the Quran.

But if the relationship of these events is that this physical Universe will end one day, then there is nothing in this as for as human guidance is concerned. But the Quran is guidance for humanity until the Day of Judgment. Who knows when this Universe is going to end? But the scientists of the West are working hard at it. They have found that Sun's temperature is slowly – albeit very slowly – going down and the Earth's movement is being affected. The solar system may disintegrate after billions of years. But human beings who are now here and those who will be around until that happens – for them there is no guidance in it. That is why I adopted the policy of giving preference to metaphorical meanings of these verses over their literal meanings. This is true in every language – words having both literal as well as metaphorical meanings. This is also true for Arabic language and Quranic words. If we take the metaphorical meanings of these events described in the last two chapters of the Quran then two things come out in

front: 1) the revolution that occurred at the hands of the Prophet (PBUH) and companions; and 2) the revolution that will occur slowly and gradually.

A new human period and the Quran

My dear friends, during the first period of Islam – the period of the Prophet (PBUH) and companions – the revolution that shattered the evil forces of darkness and injustice could also be described by these words. Shortly after this shining period the forces of darkness raised their ugly heads again and a slow process of gradual revolution that started thereafter could also be described by these words. Demands of time will slowly lead humanity towards that shining period once again; and through the hands of a dedicated group of people that same period which was produced by the Prophet (PBUH) and his companions – that is, the period where the Quran provides gravity for the collective; the period of fair and just treatment of all human beings; the period of equal dignity of all humankind – will return.

Instead of taking literal meaning of these words if we take metaphorical meaning then it would mean the revolution that occurred at the hands of the Prophet (PBUH) and companions. Also, this meaning refers to signs that the Quran has mentioned will appear during the slow and gradual process of revolution for the humanity to reach that shining period of human dignity and fraternity once again. There is no guidance for humanity if we take the literal meaning of how this Universe will end; and that is why I do not take the literal meaning of these words. On the other hand, the metaphorical meaning provides as guidance for humanity in relation to the grand revolution the Prophet (PBUH) and his companions brought about and established the system of universal sustenance. And again that universal system will replace all other systems of life in a gradual and slow revolution whose signs have been given by the Quran as guidance towards that goal. If we keep these introductory remarks in mind then there is no difficulty in understanding the verses of these last two parts of the Quran. This is the principle I have adopted for my understanding of the Quran; and this is the way I explain it to others.

The reality of splitting of the moon

My dear friends, if you remember in the verse 1 of Surah Al-Qamar – اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ – the words السَّاعَةُ (*Al-Saa'ah*) and انْشَقَّ (*An-Shaqqa*) have come. Our traditional translators and interpreters take السَّاعَةُ (*Al-Saa'ah*) to mean the

Day of Judgment and انْشَقَّ (*An-Shaqqa*) to mean the miracle of the splitting of the moon. It is mentioned in hadith that the Prophet (PBUH) signaled at the moon and it split into two. But those friends who come regularly to my lectures know that this verse really signifies the revolution that occurred at the hands of the Prophet (PBUH) and his companions. The power and the elitism of the Quresh disappeared after this revolution. The Quresh who didn't let anyone breath suffered defeat after defeat at the hands of the Prophet (PBUH) – an orphan who when he first raised his call there was no one even to second it. When he started forming his group of volunteers only the poor, the downtrodden, and the enslaved answered his call. And in the thirteen years of Prophet's life in Mecca only a handful joined his group so much so that history reports that only 313 were in the battle of Badr with him facing the mighty Quresh who were more than thousand in number and had come all the way from Mecca to Medina to attack the Prophet (PBUH) and his companions. Battle after battle they kept on attacking until, finally, they assembled all the tribes – called the battle of *Ahzhaab* – and they wanted to wipe out the Prophet (PBUH) and his companions once and for all who had taken refuse in Medina. One can easily see the asymmetry of this warfare waged by the Quresh: one side was the mighty army of Quresh laden with all the instruments of war in large numbers; and a meagre group of refugees not even properly equipped to fight a small army let alone all the combined tribes of the Quresh as well as their allies. And to say at this time that a grand revolution is coming – اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ – that would spell disaster for the Quresh would simply have been unbelievable. Who would have thought that this tiny group of refugees would defeat the mighty Quresh and their allies?!

My dear friends, the symbol of Arab *Jahiliyya* (i.e., the period of ignorance) was the moon. To mention that a nation has been defeated; that its power has been shattered – it is common practice to say that its flag has been split and torn apart. انْشَقَّ (*An-Shaqqa*) means to become torn apart. This is what had happened to Quresh – if we take the metaphorical meaning. The literal meaning of moon actually splitting does not fit here. Also, it is mentioned in Surah *Al-Qiyamah*: وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (75:9) – and the sun and the moon are brought together. If we take the literal meaning here then we cannot understand anything.

I do not have right to take metaphorical meaning on my own

My dear friends, here again we are told that sun and moon will be brought together near the end of the world resulting in its destruction. But if we take its metaphorical meaning then a very important meaning comes out. But let me emphasize that it is not up to me to take any metaphorical meaning that I want. The Quran is a book of clear (*Mubeen*) Arabic language the metaphorical meanings are written in Arabic lexicons. It is written there that sun was symbol of Iran's flag and the moon was that of Arab's. Arabs and Iranians did not like each other. Iranians considered the Arabs not even worth fighting against let alone making friends with. Iran was the superpower of those days on one side of the Arabs and the Romans were the superpower on the other side. Both of them didn't care about the Arabs. But the Prophet (PBUH) and his companions clashed with both of them.

Sun and moon getting together

My dear friends, as I mentioned the sun was the symbol of Iran and the moon was the symbol of the Arabs. Although being physically closer both were poles apart from each other in culture, behavior, and lifestyles. Both were enemies of each other. But the Quran says: وَخَسَفَ الْقَمَرُ (75:8) – and the moon is darkened. If we take the literal meaning then it does not make any sense. But if we take the metaphorical meaning then it means that the power of the Arabs will get weakened; that their power will be eclipsed. What would happen then? وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (75:9) –Iran (sun) and Arab (moon) will be brought together. And the history bears testimony that Iran was conquered and both (Arab and Iranian) regimes became one. Not only that the Byzantium also became part the same Islamic state with same government, same system, same caliphate. No one could have imagined that this would happen even few years before that grand revolution at the hands of the companions of the Prophet (PBUH) that resulted in the union of the sun and the moon. Did you see how, by taking metaphorical meaning, things became so clear and, further, that are also supported by historical evidence. There is no confusion, there is no doubt, and there is no guesswork or miracle. The plain truth about that grand revolution comes out by taking the metaphorical meaning supported by Arabic lexicons.

Now, today, we are taking up verse 1 Surah *Al-Takwir* (التکویر) that sums up the

essence of the meaning in such few words: إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (81:1) whose literal meaning is: when the sun is shrouded in darkness [Asad]. The biggest autocratic empire (*Mulukiyah*) of the day having the symbol of power as sun will be shrouded in darkness; its system will be wrapped up.

My dear friends, *Al-Takwir* (التکویر) means enfolded; enwrapped like the way a turban is wrapped around the head: the head stays in its place but the cloth is wrapped around by moving it around the head. This kind of enwrapping of alternating movement of days and nights around the sun is called *Al-Takwir* (التکویر).

Hiding of the sun beneath the throne

My dear friends, what to say of these Arab people! In those days from where these people got this concept of enwrapping by alternating motion of days and nights is simply amazing! But look at our latter-day interpreters and narrators of hadith and their reply to where the sun goes in the night? The hadith says that the sun hides beneath the thrown of God in the night and the angels push it out in the morning! This cannot be the hadith of the Prophet (PBUH). The mental level of the narrators of hadith was such that they could not comprehend the truth about this; – so they came up with this hadith and people accepted this at their low mental level. But the Quran – which is the revelation from the Creator of the Universe – explains this phenomenon that fits exactly with modern scientific data. But the amazing thing is that the Arabs of that period how advanced they were in constructing their language that they had a word to describe this phenomenon of alternation of day and nights which modern science has revealed to be the true description. One can clearly notice the difference between the description given in the Quran and that given in hadith. Look at how advanced the Arabs of those days were from the point of view of language? Using the metaphor of enfolding of days and nights in relation to the sun is a great literary style to explain this phenomenon. Even giant poets could not come up with such a metaphor. As I mentioned taking the metaphorical meaning of sun as Iran whose system of *Mulukiyah* would be enfolded, whose flag would be enwrapped – explains the meaning very clearly. This was a grand proclamation! This was a huge claim considering the fact this was being announced by a weak and small group:

A worthless dust particle!—and claiming to build a city in a barren desert?!

This is huge claim that Iran's power (the sun flag) will be enfolded and wrapped up! This claim was being made by the leader of by small and weak group not having its own state – if this proclamation was made in Mecca or at most having a city-state if it was made in Medina. *This* is the meaning of the verse إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (81:1).

Style of the Quran – an interesting event

My dear friends, I have mentioned this many times before: the Arabs, until today, have not been able to decide what the style of the Quran is. There are great literary luminaries and poets among Arabs. There are many non-Arab experts of Arabic literature who could not decide the style of the Quran – whether it is poetry or prose. These are the only two styles in literature. There was a news item recently that an American musician, on hearing the recitation of the Quran, asked whose poetry it was that was being recited? He was extremely surprised when told that this was not poetry but prose. He exclaimed: this is prose and it has such a beautiful rhythm? – This is not possible; that for musical rhythm poetry is essential; that you cannot sing any prose in such beautiful rhythmic style? He proclaimed that this cannot be prose and became obsessed with it. He went to several reciters of the Quran and listened to many Surahs of the Quran. When he came to Surah Al-Rahman and listened to its recitation then he became a Muslim.

My dear friends, this is the reality of the Quran – so far it could not be decided what its style is – whether prose or poetry. There is so much rhythm in its recitation that a classical musician becomes captivated by it. If you have even a little bit of knowledge of classical music then you would know that classical ragas rhyme perfectly with Quran recitation. It is a strange thing – the Quran is a book of prose but when it is recited then it fits in perfectly well with classical music.

It is a different thing

My dear friends, I know some classical music. I know the difference between the *Hejaz* and the Egyptian style of recitations: *Hejaz* style is in raga *Bhairon* and the Egyptian style is in raga *Bhairawi* over which the listeners feel rapturous although it is not poetry that is recited. I am talking here of style, not meaning. The meaning of the Quran is altogether a different matter. I have pointed this out here because the verses which we are discussing in our lecture today have within them beautiful rhythm. Take a look and feel the rhythm:

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (81:1-9). The standard translation: WHEN THE SUN is shrouded in darkness, and when the stars lose their light, and when the mountains are made to vanish, and when she-camels big with young, about to give birth, are left untended, and when the seas boil over, and when all human beings are coupled [with their deeds], and when the girl-child that was buried alive is made to ask: for what crime she had been slain [Asad].

What to say of this rhythmic flow my friends! Whether or not one understands the meaning one is immediately transported into ecstasy just by reading these verses! And this is not poetry. The writer Himself had to say it is not poetry. He said that We have not taught Our Messenger poetry; that poetry is not worth his high status. This is entirely a different thing!

I saw beauty all the world over;
But you are different altogether!

The Quran is not poetry. It is not prose. Then what is it? Well! It is something else. Until today, in these 1400 years, anyone who has examined the Quran from literary point of view comes to the conclusion that it is something entirely different. Friedrich Nietzsche appreciated it. He said that the language of revelation is neither prose nor poetry. The last book he wrote is a unique book. He has coined a new phrase to describe this book as if it were written in a new language which was neither prose not poetry. He abandoned both these specific styles for writing this book and said that it is something different. However, human mind has not been able to come up with a style that resembles the style of the Quran.

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (81:1) – Iran's flag will be folded. This is being told in a passive tense in which the noun is not revealed. It is not told explicitly how or when this will be done or who will do this. But the Quran does say emphatically that it *will* happen; that it *will* be the case.

Iran and Rome were the superpowers of those days. They had established small satellite states (or stars) all around bordering the Arabs. It is these satellite states that the Prophet (PBUH) and companions had their initial clashes with. These were not powers (sun or moon) themselves but were their little stars of their influence bordering the Arabs. The Quran says: وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (81:2) – and when the stars lose their light. كَدَرَتْ (*Kadarat*) means: to get scattered; to lose

luster; to become depressed; to become weak; or to get extinguished. The Quran has brought the word نجوم (*Nujoom* or stars) in reference to the words قمر (*Qamar* or moon) and شمس (*Shams* or sun). The Quran uses the words "sun" and "moon" to represent big powers and their little satellites by the word "stars"; and it uses the word "mountain" or جبال (*Jibal*) to describe the powerful tribal leaders within these satellite states: وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (81:3) – and when the mountains are made to vanish [Asad]. This is the third level of power.

All levels of autocratic authority and power were smashed

My dear friends, the Quran has pronounced the end of each and every level of unjust authority and power: superpowers will be made to become extinct; their satellite states and tribal leaders behaving as powerful as mountains will be crumpled and made dustbowl. This will be the result of the grand revolution that will occur at the hands of the Prophet (PBUH) and his companions. And history bears testimony that this great revolution in the history of humankind did occur: the moon of the Arab *Jahiliyyah* was split and torn; the powerful sun of Iran was folded and wrapped; satellite states under the influence of Rome and Iran were laid low and extinguished; and their tribal leaders as powerful as mountains were crushed to dust.

The next step – the slow speed of trial-and-error process

My dear friends, the Quran has also said that after this period the three evil forces – autocracy, priesthood, and capitalism – will raise their ugly heads and exploit humanity for their own ends. It will take a long time after that to get to a period of humanity because it will happen gradually by slow speed of evolution. Revolution could happen fast but evolution happens extremely slowly – human society, human behavior and habits, and mental attitudes – these things take long time to change. Human intellect tries one thing and, after considerable time elapses, when it finds that it does not solve human problems then it tries something else. Human intellect can only proceed by trail-and-error for solving human problems; and comes up with improved system of life after every failure. And that is why it takes long time to change course and to change history. This way, after multiple trials and errors and going through untold sufferings and devastations, it reaches the same place what the revelation provides on day one as its guidance. This is a unique thing and that is why the Quran has given so much

importance to history and its lessons to humanity at-large. One needs to study history from this angle to see which systems of life human intellect devised and what wrong results it produced, and then what changes human intellect came up with and implemented in society as a consequence. This gradual process of trial and error continues as human history keeps moving further.

After every failed experiment humanity's next step is towards the Quranic system

My dear friends, if you study history from this point of view then you will be surprised to find out that any new system that humans adopted after each failure, it was a step towards the Quranic system. It is necessary to compile history from this point of view. Iqbal said on this issue in his own style:

Intellect and revelation both guide and lead the human column;
Intellect by slow trial and error; revelation by its self-momentum!

The intellect moves towards the destination slowly step-by-step using the means at its disposal – by force; by wars; by shedding and spilling blood; by torture and death; by manipulation and deception; by drowning in rivers of human blood. But revelation lifts the curtain from reality right away and shows the destination clearly, and takes the humanity towards that by one giant step. This is not the result of trial and error employed by intellect but that of the push of reality employed by revelation now preserved in the Quran. Thus revelation economizes human effort as Iqbal has alluded to.

The period Quranic rule is not far off

My dear friends, the Quranic permanent values are slowly replacing the ephemeral man-made relative values. The Quran has mentioned signs of the coming of that period; and I see those signs coming based on my understanding of the Quran. I am quite hopeful that the period of the Quran is near. Why am I so hopeful? For that you have to look for the signs that the Quran has mentioned. What was camel to the life of Arabs? To Arabs, camel was the most useful, the most valuable, and the most essential means. Almost every aspect of their life revolved around the camel. The Quran says: وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (81:4) – and when she-camels big with young, about to give birth, are left untended. That is, when the she-camel at a most valuable time in its life will become useless.

My dear friends, to say this 1400 years ago to the Arabs that a period will come when the camels will become useless – and not just any camels but the most

valuable ones called عِشَار (the most useful she-camels) – this would have been unthinkable. Not that these camels would become extinct; not that they would suffer any natural disaster but that they would become useless. To say this 1400 years ago was an extraordinary future claim.

How would camels become useless?

Do you see how camels have become useless now? Have you noticed how cars, trains, and planes have replaced the camels in the heartland of camels not to mention other lands? Even small journeys are made by helicopters nowadays? Saudi Arabia is very proud of its modern high-speed high-flying transportation system. Camels have become useless although they were the center around which desert life revolved there just a few short years ago. One cannot see camel journey there anymore. Fourteen hundred years ago no one could have thought but we now see this Quranic sign clearly – وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (81:4) – as to how camels have become useless in the life of humans now. Another sign that no one could imagine at the time when the Quran came and which is now obvious is this: وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (81:5) – and when all beasts are gathered together. وَحُوْشُ (*Wuhoosh*) means those who live in habitat in remote deserts of Arabia or deep forests of Australia or Africa or South America separated from settled population. At the time of the Quran there were very few settled cities where people lived as nation-states, especially under Iran and Rome empires. There were hardly any cities in Arabia and most of its population used to live nomadic life in its deep deserts. City dwellers used to call them uncivilized or وَحُوْشُ . They were divided into primitive tribes and clans. They had no idea of community life as a nation. This was the case in most places in the world at the time.

The concept of nation-state in Africa

The primitive tribes of Africa and Australia were normally referred to as barbarians. But tribal life is disappearing now. The concept of nation-state is emerging among the tribal peoples of Africa and South America and they are occupying seats at the UNO as member states. Many do not know even the names of these new countries but they are recognized as members of UNO. Many of these countries did not exist even a few years ago. The Quran said: وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (81:5) – and those who were not even aware of the concept of nation (وَحُوْشُ) are now becoming nations. Do you see how the Quran predicted

this 1400 years ago? After this the Quran goes on to say: وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (81:6) –And when the seas rise [Pickthall]. Those days when the Quran was revealed there were very few ships prowling in the seas. And they were hardly visible. Arabs living near the seas used to have small dingy type boats. They could hardly imagine oceans full of ships large and small. But look what is the case now?

Oceans would become full of ships

My dear friends, the Quran says here that oceans will become full of ships. بحَار (Bihar) means oceans and it also means towns and cities on the shores of oceans. Those days when the Quran was being revealed there were very few towns on the shores of oceans. Ships were hardly visible. But look at now? The global trade depends on oceans. Beautiful cities are dotting on the shores of the oceans. Ships of all kinds are filling the oceans as if the oceans are boiling with ships. When that happens, oceans' shores will become populated with cities all around the globe. This is what the Quran mentions: وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (81:7) – When the souls are sorted out, (being joined, like with like).

My dear friends, what to say of this?! What we call means of communications is nothing but means of joining people with people. What were these means in the not too distant a past? – Nothing but postcards via the post office. Even the post offices used to be in cities. Village people used to travel miles after miles to get to the nearest post office. Often the postman used to come to a village once a weak to deliver letters. Where there was no such facility people did not have any means of communication to get in touch with each other.

Communications system

My dear friends, the means of communications has developed so much now that one can talk to anyone at any time anywhere in the world instantly at the speed of light. Communications technology has advanced to such an extent that one can monitor heart rate of astronauts deep inside the space from here on earth. I remember vividly when space mission to the moon was going on that a ground controller mentioned that an astronaut was sleeping. When asked how he knows that the astronaut was sleeping. He said that I know because the heart rate of a waking person is different from that of a sleeping person. This is the miracle of technology. And don't ask how far this technology has advanced nowadays? But the Quran said this 1400 years ago: وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (81:7) – When the souls are sorted out, (being joined, like with like). When individuals will be joined together

and become one. Allahu Akbar! Only Allah could say this 1400 years ago, my friends! At that time there was no question of any sign at all of this kind of technology. What to say of the Arabs! Even the good old post office is the invention of the not too distant past by the West. And to say to Arabs – وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (81:7) – When the souls are sorted out, (being joined, like with like) – was a great revolutionary thing. The next verse presents an extremely delicate and important aspect of the Arab *Jahiliyyah* period that is an extremely sensitive and challenging thing both intellectually and emotionally.

What happened when a daughter was born?

My dear friends, the most important issue of our time is coming up next which I will it explain later. But you can imagine what the status of woman was at the time based on the Arab *Jahiliyyah* tradition of burying baby daughter alive? *This* was the position of woman to Arabs? The Quran, at this point, talks about woman in general not just the baby girls that used to be buried alive. It presents this in a style that cannot be done in any better way to capture the complaint of the baby girl that was buried alive. As such man has always buried woman alive – be it literally during the period of Arab *Jahiliyyah* or be it figuratively or otherwise in today's so-called modern civilization. Don't ask what a captivating style the Quran adopts to describe this! But I do not want to start this topic and leave it in the middle. So, I will take it up in the next lecture.

My dear friends, we have completed verse 7 of Surah *Al-Takwir* (التکویر). We will start the next lecture with verse 8.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

سانحہ ارتحال

ادارہ کے نائب چیئرمین اور بزمِ طلوع اسلام مینگورہ، سوات کے نمائندہ خورشید انور صاحب کی والدہ محترمہ 14 جولائی 2015ء کو وفات پاگئیں۔ ان کی نمازِ جنازہ فتح پور سوات میں ادا کی گئی۔ مرحومہ کی زندگی مومنانہ شعار کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ یہ ان کی تربیت کا اثر ہے کہ خورشید انور اور ان کے بھائی برکت علی خان، اختر علی خان، راحت علی خان، اور مرحوم انور علی خان کے بچے نہایت اتفاق اور محبت کے ساتھ اکھٹے رہ رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور کروٹ کروٹ جنت عطا کرے۔ ادارہ خورشید انور صاحب اور ان کے تمام بھائیوں اور خاندان کے تمام افراد کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

چیئرمین
ادارہ طلوع اسلام

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.68
ISSUE
10

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
web:www.toluislam.com

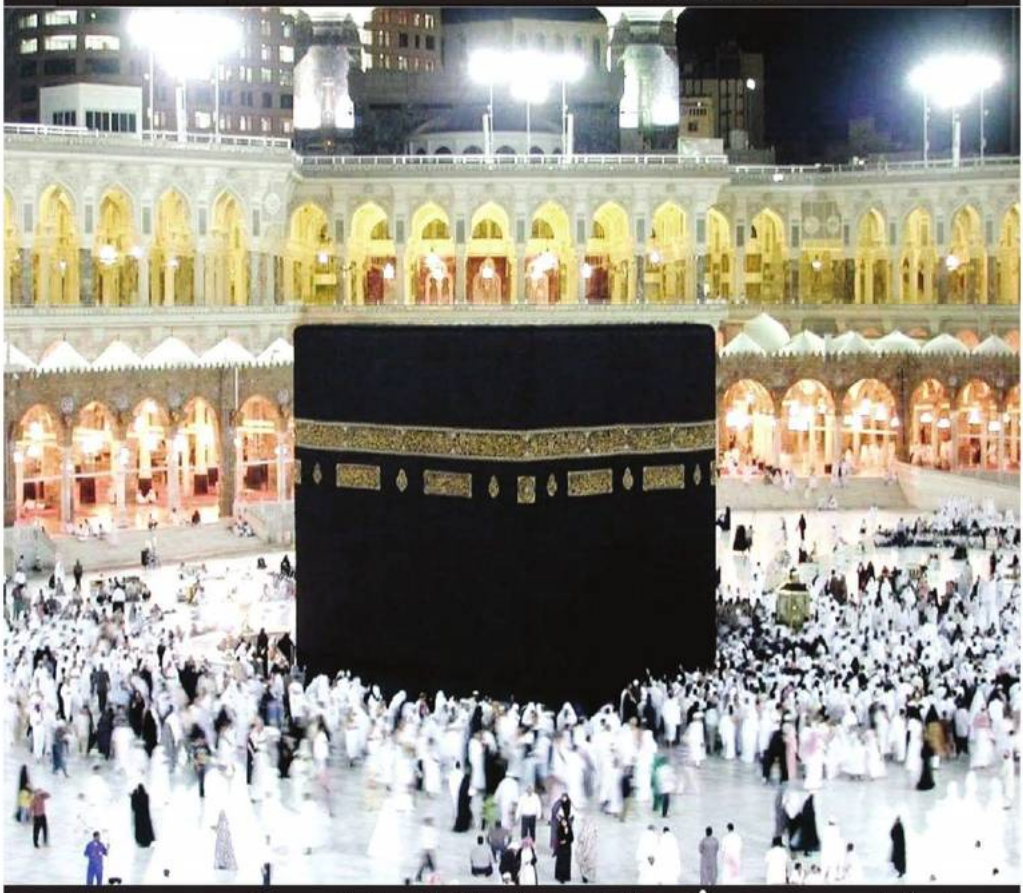

آپ کی طرف یہ صاف اور واضح ضابطہ قوانین اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ آپ اس کے ذریعے سب سے پہلے اس مرکزی بستی (مکہ) اور اس کے اردگرد کی آبادیوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج وعواقب سے آگاہ کردیں اور انہیں متنبہ کردیں۔(42:7)

مفہوم القرآن جلد سوم سے ایک اقتباس